ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ندائے اعتدال

جولائی ۲۰۱۴ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	رمضان کا پیغام	پھر آ گیا نیکیوں کا موسم بہار	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	
۲۔	اداریہ	حسن اخلاق- خاموش دعوت و پیغام.....	مدیر	۳
۳۔	گوشۂ سیرت	قرآن نوع انسانی کا میکنا کارٹا (قسط-۷)	تحریر: مسٹر اڈیار، مترجم: ایم، اے، جمیل احمد	۸
۴۔	تاریخ کے جھروکوں سے	مختصر تاریخ ثقافت اسلامی	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۱۱
۵۔	رمضان المبارک	آداب رمضان	مولانا محمد یوسف لدھیانوی	۱۷
۶۔	پیام عید	عیدالفطر کا پیغام مسلمانان عالم کے نام	مولانا حافظ کلیم اللہ عمری	۲۲
۷۔	زکوۃ	زکوۃ کیسے ادا کریں	مفتی محمد تقی عثمانی	۲۶
۸۔	بحث و تحقیق	حدیث کے بارے میں شیعہ اور.....	محمد فرید حبیب ندوی	۳۳
۹۔	فقہی مباحث	بیع وفا (بیع بشرط واپسی) کا شرعی حکم	محمد قمر الزماں ندوی	۳۶
۱۰۔	فریضۂ دعوت	ملک کے انتخابی نتائج: دعوتی نقطۂ نظر.....	محمد الیاس محی الدین ندوی بھٹکلی	۴۲
۱۱۔	مدارس اسلامیہ	قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم	مولانا ندیم احمد انصاری	۴۹
۱۲۔	تذکیر	دنیا کی حقیقت: قرآن کی نظر میں	محمد فرمان ندوی	۵۳
۱۳۔	اصلاح معاشرہ	شادیوں کی چند رسوم و خرافات	محمد شعیب ندوی	۵۵
۱۴	نقطۂ نظر	کیا اب بھی موجودہ نظام تعلیم پر.....	پروفیسر احمد سجاد	۶۲
۱۵	آخری صفحہ	دیکھو انہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو	م۔ق۔ن	۶۴
۱۶		صدقہ فطر	محمد فرید حبیب ندوی	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہو سکتی ہے۔

اداریہ

حسن اخلاق- خاموش دعوت و پیغام

(مدارس اوراس سے وابستہ لوگوں کے لئے خاص تحریر)

نوٹ: بعض وجوہات کے سبب اگست کا شمارہ شائع نہ کر کے انشاءاللہ اس کو ستمبر کے شمارے کے ساتھ شائع کیا جائے گا، قارئین سے معذرت کے ساتھ درخواست ہے کہ رمضان کی خاص دعاؤں میں یاد رکھیں، انشاءاللہ جلد اگست ستمبر کے شمارے کے ساتھ حاضری ہوگی۔ (ادارہ)

ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک میں مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی آبادی ہے، سرکاری اعداد وشمار کے مطابق مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۲۰ فیصد ہے، ویسے کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد ۳۰ فیصد اور کم از کم یقینی طور پر ۲۵ فیصد تو ضرور ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ اتنی بڑی آبادی کے باوجود یہاں مسلمانوں کے خلاف تعصب کا ماحول پایا جاتا ہے، یہاں کی فضا میں نفرت وعداوت اور ناپسندیدگی کی بو آتی ہے، تلخیاں ہوتی ہیں، زیادتیاں ہوتی ہیں غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں، اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، روز نئے نئے مسائل کھڑے ہوتی ہیں، جن میں سے اکثر غلط فہمیوں اور نفرتوں کی وجہ آپسی میل جول کی کمی اور حد سے زیادہ دوری ہے، دعوتی کردار کا مفقود ہونا تو بڑا سبب ہے ہی ساتھ ہی اخلاقی اقدار کی پاسداری نہ کرنا بھی مہلک ثابت ہو رہا ہے، اس سلسلہ میں ماضی کی کوتاہیوں، تلخیوں اور زیادتیوں سے قطع نظر مجھے سطور ذیل میں حال پر گفتگو کرنی ہے۔

ذرا اس حقیقت پر بھی نظر ڈالتے چلیے کہ اسلام کی اشاعت باجماع مورخین محض اخلاق سے ہوئی ہے، تاریخ کے ہر اس دور میں جس میں کہ مسلمانوں کو عروج ہوا تو اس کا سبب یہی رہا کہ ان کے حسن اخلاق نے ان کے لئے دلوں کو فتح کرنے کی راہ ہموار کی ہے، پروپیگنڈہ کرنے والوں نے بہت جتن کیے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کے جور وجبر کو بہت دخل ہے لیکن اس پروپیگنڈے کو باطل قرار دینے کے لئے بسا اوقات انہیں کی صف میں سے لوگ کھڑے ہو گئے اور یہ صدا ہوا کہ ؎ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اسلام کے فلسفۂ اخلاق نے اس تریاق کام کیا جس کے استعمال سے زندگی کی ضمانت یقینی ہے، اس کی مقناطیسی

قوت نے ملکوں کو نہیں، قوموں کو نہیں دلوں اور دماغوں کو فتح کیا، نبی پاک علیہ السلام اخلاق کے اس مرتبہ پر فائز ہوئے کہ قرآن نے آپ کے اخلاق کو ''خلق عظیم'' کی سند عطا کی، صحابہ کرام نے اسی کو اپنی شخصیت کیلئے سامان زینت سمجھا، ان کے ''حسن خلق'' کے سبب دلوں کی فتح ہوتی گئی، دماغ مسحور ہوتے گئے اور اسلام پھیلتا اور پھولتا رہا حتی کہ عالم رنگ و بو کا کوئی گوشہ نہ رہ گیا جہاں اسلام کی صدائے بازگشت سنائی نہ پڑے۔

اس سے پہلے کہ میں مقصد تحریر کی طرف آؤں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ''حسن خلق'' یعنی اچھے اخلاق، اعلیٰ اخلاق اور حسن سلوک کی تشریح بنیادی طور پر یہ ہے کہ آدمی نیکیوں کو انجام دے، بشاشت وجہ کا مالک ہو اور دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے گریز کرتا ہو، حضرت عبداللہ بن مبارک نے ''حسن الخلق'' کی یہ بہت جامع، محیط اور مختصر سی تشریح فرمائی ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان ہی تین چیزوں پر ''حسن اخلاق'' کی عمارت تعمیر ہوتی ہے، بشاشت وجہ سے انسان ہزار غموں کو فنا کر سکتا ہے، دوسروں کے مرض کی دوا محض ایک مسکراہٹ سے فراہم کر سکتا ہے، ہزار بدگمانیوں اور عداوتوں کو ایک تبسم کے تیشہ سے قتل کر سکتا ہے اور نیکی کی عادت اسے مقبول عند اللہ اور قبولیت عام عطا کر سکتی ہے، اس لیے کہ پھر وہ مساوات برتنے کا عادی، ایثار کا خواہاں و دلدادہ، عفو و درگذر کی صفت سے متصف، غصہ پر قابو پانے والا، دوسروں کو آگے بڑھانے والا اور قدرت کے باوجود معافی کا اعلان کرنے والا، اپنے حق سے دست بردار ہونے والا اور جانے کیا کیا اور کیسی کیسی عطر بیز و مشک آمیز ایسی عمدہ صفات کا حامل ہوگا جن پر نبوی اخلاق کا عکس ہو، اللہ تعالیٰ بھی ایسے ہی لوگوں کو پسند فرماتا ہے، ان سے محبت کرتا ہے، والكظمين الغيظ والعافين عن الناس والله يحب المحسنين (آل عمران:۱۳۴) حسن خلق پھر اس کے اقسام و شعبوں پر اگر سیرت سے واقعات نقل کیے جائیں اور صحابہ کی زندگیوں کے نمونے درج کیے جائیں اور احادیث سے وضاحت کی جائے تو بات بہت تفصیلی ہو جائے گی اور مقصد یہاں تفصیل نہیں بلکہ ایک امر ناگزیر اور کربناک صورت حال کی طرف اشارہ کرنا ہے، اس لئے بس یہ سمجھنا کافی ہوگا کہ حسن خلق وہ نعمت عظمی ہے جس کو ایک عظیم الشان صفت کے طور پر اللہ تعالیٰ نے بڑے پرشکوہ اسلوب میں قران میں یوں نقل کیا انك لعلى خلق عظيم اور زبان رسالت نے اس کی اہمیت کو یوں واضح کیا ما من شئ أثقل في ميزان المؤمن يوم القيامة من حسن الخلق.. (ترمذی) کہ بندہ مومن کے نامۂ اعمال میں روز قیامت حسن خلق سے زیادہ قیمتی اور وزن دار کوئی چیز نہیں ہوگی، **اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی شخص نبوی اخلاق کو اپناتا ہے اور حسن الخلق کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے تو وہ اسلام کا عملی شارح و مبلغ ہوتا ہے، اس کے اخلاق و عادات خاموش انقلاب کے داعی ہوتے ہیں، اس**

کی سچائی، امانت و دیانتداری، حسن سلوک و وفا شعاری لوگوں کے لئے حسن ظن اور اسلام سے قریب ہونے کا سبب بنتی ہے، ایک خوشگوار فضا ہموار کرنے میں ایسا شخص بنیادی کردار ادا کرتا ہے، پھر جتنے لوگوں میں یہ خصائل حسنہ منتقل ہوتے ہیں، جتنے لوگ اسلام سے قریب ہوتے ہیں اور اسلام کی روح ان میں اترتی ہے، اس کی حلاوت کی لذت سے شادکام ہوتے ہیں، یا جتنے لوگ اسلامی اخلاقیات سے متأثر ہوکر مشرف بہ اسلام ہوتے ہیں ان سب کے اعمال خیر میں اس کو حصہ ملنا یقینی ہے، ظاہر ہے کہ تبسم ریزیوں سے دل جیت لینا کچھ مشکل تو نہیں، جذبۂ تعاون کا اظہار بہت چھوٹے چھوٹے کاموں کا طالب ہے، جھوٹ سے نفرت کا اظہار اور سچ کی بالادستی وافادیت کو ظاہر کرنا بہت آسان ہے، اور اگر نفع کا ذریعہ بننا مشکل ہو تو ایذا رسانی سے باز رہنا اور اس کا بہ تقاضۂ حکمت اظہار کرنا تو بہرحال آسان ہے، ان آسانیوں کے ذریعہ عملی طور پر اسلام کے مطالعہ کی دعوت دینا اور اس کے متعلق پروپیگنڈہ اور نفرتوں کو دور کرنا یقیناً بہت آسان ہے اور شاید ان ہی آسانیوں کے سبب زبان رسالت نے حسن الخلق کو سب سے زیادہ جنت میں داخل کرنے والی چیز بتایا ہے۔۔۔سئل رسول اللہ ﷺ عن اکثر ما یدخل الناس الجنة قال تقوی اللہ وحسن الخلق.... (ترمذی)

لیکن صد افسوس کہ جو لوگ اس تعلیم سے بہرہ ور ہوتے ہیں جسمیں اسلامی اخلاق ہی نہیں بلکہ اسلام کا فلسفۂ اخلاق تک شامل ہوتا ہے وہ عملی طور پر حسن الخلق کے مظاہرے سے معذور ہوتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اتنی بڑی تعداد میں مدارس اسلامیہ ہونے کے باوجود غیر قوموں سے وہی دوری و خلیج ہے جو ان ممالک میں ہے جہاں برصغیر جیسے کسی مدرسہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، وجہ چاہے جو بھی ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہم نے اپنی دعوت و تحریک اور تمام تر کوششوں کو اپنی قوم تک محدود کرلیا ہے، اگر غیر قوموں کو ہم عملی طور پر دعوت اسلام نہیں دے سکتے یا ایسا کرنے کی پوزیشن میں نہیں (بعض لوگوں کا خیال ہے) تو کم از کم اسلامی اخلاق کے مظاہرے سے انہیں قریب تو کیا جا سکتا ہے اور اسی قربت سے بے شمار دوریوں اور نفرتوں کو ختم کیا جا سکتا ہے، لیکن کیا کیجئے اس حرماں نصیبی کا جو ہماری زندگیوں کا لازمی حصہ بن گئی ہے، ''حسن الخلق'' کی تعلیم تو ہم عام کرتے ہیں، اس کی تشریح میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں لیکن بذات خود بسا اوقات بھری گرمی میں آنے والے ہانپتے ہوئے شخص کی سوکھی زبان تک نظر نہیں جاتی، کوئی ضعیف سامنے لڑکھڑا رہا ہو تو خود کو اسے سہارا دینے کا مکلّف نہیں سمجھتے، ہمیشہ دوسروں کا سلام لینے کے منتظر رہتے ہیں، خدمت لینے کے تو عادی ہیں لیکن خدمت کرنے کی کبھی توفیق نہیں ہوتی، ملازموں اور ماتحتوں کے ساتھ سلوک تو بس کیا کہیے!! شخصیت اور مناصب کا ایسا طرہ کہ کمزوروں اور غریبوں کو اور ان کی اولادوں کو بسا اوقات تو انسان بھی نہیں سمجھا جاتا

موروثیت اور خاندانی نظام کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے تمام تر اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے، حالانکہ ہر زندہ آنکھ محسوس کر رہی ہے کہ ہر تحریک و تنظیم اور ادارے کے زوال میں اس نظام کی چاہت کا بڑا دخل ہے، اور حد تو یہ ہے کہ غیبتوں کی لعنت، فریب و دھوکہ اور جھوٹ کی عادت، چغلخوری اور تملق اور حسد و جلن جیسے کبائر کو بعض عبادتوں کی خوبصورت چادر میں لپیٹ کر اپنے آپ کو دیندار ثابت کیا جاتا ہے، لیکن کیا پتہ کہ ایسے ہی مرصع سجدے کبھی کبھی کفر کا بھی بہانہ بن جاتے ہیں، عبادتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے اور بالخصوص اس کی تشریح کرتے ہوئے یہ بات خوب ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ''حسن الخلق'' خود عبادت میں شامل ہیں، ایک طرف اسلام کا وسیع دامن پھر لفظ عبادت کی وسعت ہر اس اچھی بات اور اچھی عادت کو عبادت بنا دیتی ہے جو خود خیر یا خیر کا ذریعہ ہو، انسان جو بھی خیر کے اعمال انجام دیتا ہے وہ ایک قسم کی عبادت ہے، عمل صالح کی یوں تو بنیادی تقسیم عبادات، اخلاق، معاملات کے علحدہ عنوان قائم کر کے کی گئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اخلاق و معاملات واقعی اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوں تو وہ بھی عبادت ہیں، اور نبی پاک ﷺ کی سیرت و سنت میں ہم کو ان تینوں کی دلکش و دلآویز اور اعلیٰ، مثالی قولی و عملی تشریح ملتی ہے، جس کا پرتو اگر ہماری زندگی پر پڑے تو اس سے نہ صرف اپنی زندگی منور ہو بلکہ اس سے منور زندگی کے نور سے اسلام کی کرنیں پھوٹیں اور ان کرنوں سے جانے کتنی زندگیاں آباد و منور ہو جائیں۔

ہندوستان کی صورت حال کو ذہن میں رکھیے اور الحمد للہ اس کے طول و عرض پر پھیلے ہوئے مدارس اسلامیہ کے جال کو دیکھیے جو سیرت رسول کے امین، قرآن و سنت کے محافظ اور پاسبانِ دین و دعوت ہیں، جہاں شمائل نبوی کا درس ہوتا ہے، جو اسلامی تشخص کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ مدرسہ سے متصل آبادی بھی ان کے قول و فعل سے متاثر نہیں ہوتی بلکہ ایسی خلیج ہوتی ہے کہ آبادی والوں سے اہل مدارس کا رابطہ بھی نہیں ہوتا اور ارباب مدارس سے ملاقات یوں بھی مشکل!! غیروں کی تو چھوڑیے اپنے بھی بیگانے ہوتے ہیں، جبکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جو مدرسہ جہاں واقع ہوتا وہ واقعی منارۂ نور ہوتا، اس کے قرب و جوار اور اطراف میں وہاں کے طلبہ و اساتذہ کے شوقِ خدمتِ خلق اور حسن اخلاق کے مظاہروں سے مسلمان تو مسلمان بنتے!! ساتھ ہی غیر مسلم بھی دیکھنے آتے، مل بیٹھتے اور قریب آ کر دیکھتے، بہ چشم دل سیرتِ اسلام، سلوکِ اسلام، صدقِ اسلام اور حقیقتِ اسلام کا مشاہدہ کرتے لیکن افسوس کہ یہ مراکز بھی دیگر تحریکوں اور دینی رنگ رکھنے والی جماعتوں کی طرح اپنے خول میں قید اور اپنی محدود افادیت میں محصور ہو گئے، چند روایات کی پاسداری اور حفاظت اسلام اور خدمت دین کے نام پر پیوند کاری ان کا وظیفہ ہو گئی، ان کی افادیت سے غیر مسلم تو دور خود مسلمان بھی محروم

رہنے لگے، بات تلخ ضرور ہے لیکن مشاہداتی حقائق پر مبنی ہے جس کو پہلے بھی میں ایک مفصل تحریر میں لکھ چکا ہوں، **تلخ بات میں اکثر سامان عبرت ہوتا ہے، لیکن ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم اپنے مخصوص پیمانے سے بات کی تلخی کو ناپنا شروع کر دیتے ہیں البتہ اس سبق کی طرف توجہ نہیں ہوتی جس کے سبب یہ تلخ حقیقت منظر عام پر آتی ہے، بہر حال زندگی ہے تو تلخیاں تو سہنی پڑیں گی**، آج ہمارے مدارس میں اخلاقی وفکری تربیت کا جو فقدان ہے اس سے انکار گویا حقیقت کا انکار ہے، اگر مدارس کی چہار دیواری کے اندر واقعی حسن اخلاق کا مظاہرہ ہو تو طلبہ واساتذہ راستوں میں، اسفار میں، اپنے اپنے علاقے میں، خود مدارس کے آس پاس اور عام مقامات Public Places پر اسلام کی خاموش اور عملی دعوت بن کر نمودار ہوں اور خاموش انقلاب کا نقطۂ آغاز قرار پائیں، لیکن صد افسوس وہ رذائل وکبائر جن کی اصلاح کا بیڑا ہم خود اٹھائے ہوئے ہیں خود ہماری مجلس کا وہ ناگزیر حصہ ہیں، جھوٹ، غیبت، بدگمانی، تہمت والزام تراشی بے پناہ آپسی چپقلش، ذرا ذرا سی بات پہ رنجش، نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر دینی، سماجی اور ترقیاتی کاموں میں راہ کا روڑا بننا، تعاون علی البر کا فقدان بددیانتی، دروغ گوئی کی اس قدر ہمارے یہاں کثرت ہے کہ گویا ''حسن الخلق'' صرف تعلیم وتعلم کے لئے ہی خاص ہے، حقیقت اور عملی زندگی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیوں کہ اپنی ہی کوتاہی اور متضاد تصویر کی منظر کشی مقصد نہیں، بلکہ یہ وضاحت کرنا مقصد ہے کہ ہمارے اس عملی تضاد (جس کے مشاہدات وواقعات لاتعداد ہیں) کے سبب ہمارا دعوتی کردار نہ صرف داغدار ہوتا ہے بلکہ اب وہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آج ہندوستان کے طول وعرض پر تقریبا تعداد میں یہ مدرسے پچیس ہزار ہو گئے لیکن غیر مسلموں سے قربت نہ ہو سکی، نہ ہی انہیں دین کی دعوت دی جا سکی اور نہ عملی طور پر اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا جا سکا، بلکہ آخری اور سچی وافسوسناک بات یہ ہے کہ خود اپنے آپ کو مکمل اسلامی زندگی سے نہ آراستہ کیا جا سکا، اسلامی اخلاقیات تحریر وتقریر کے لیے خاص ہر کر رہ گئیں، عملی زندگی میں ہم کسی سے کم نہ رہے، شاید اسی لیے حکیم مشرق نے ماتم کرتے ہوئے اپنی حسرت کا یوں اظہار کیا تھا۔

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

گوشۂ سیرت (قسط-۷)

''اسلام- جس سے مجھے عشق ہے''

قرآن نوع انسانی کا میگنا کارٹا

تحریر: مسٹر اڈیار ترجمہ: ایم اے جمیل احمد

بالعموم مذہبی کتابیں دعویٰ تو یہ کرتی ہیں کہ وہ انسان کو خدا سے ملاتی ہیں لیکن عملا دیکھا یہ گیا ہے کہ وہ انسانوں کو بادشاہوں، جاگیرداروں اور پجاریوں کے آگے جھکا دیتی ہیں اورعوام کو زنجیروں سے جکڑنے اوران کو بالکل مجبور بنا دینے کا کام بھی یہی کتابیں انجام دیتی ہیں۔

حکمرانوں کو خدا کا اوتار، نمائندہ اور ظل الٰہی کے القاب سے نوازا گیا بعض کتابوں میں تو صفحہ قرطاس کی حد تک انسانی آزادی کی بات کہی گئی ہے لیکن عملی طور پر انسان کو انسانی غلامی سے نجات دلانے میں وہ ناکام رہی ہیں۔ دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآنِ حکیم پکار پکار کر کہتا ہے کہ انسان کو انسان کی بندگی نہیں کرنی چاہیے۔ انسان کو انسان کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے۔ انسان کو انسان کی پوجا نہیں کرنی چاہیے۔ انسان کو دوسرے انسانوں کے آگے دستِ حاجت دراز نہیں کرنا چاہیے۔ قرآن نے ان تعلیمات کو اس شدومد سے بیان کیا کہ اس کے ماننے والوں کی رگ وپے میں یہ خیالات خون بن کر دوڑنے لگے۔ اس طرح قرآن نے پرستش کا، بندگی کا اور اطاعت واستعانت کا مستحق صرف اللہ کی ذات کو قرار دیا ہے۔

اس تعلیم کو اپنانے سے کیا ہوتا ہے اور عملا کیا ہوا؟ انسان پر سے انسان کی خدائی مٹا دی گئی۔ انسان پر ظلم وطغیان کا سدِ باب ہوا۔ انسانی فکر وارتقاء پر روک لگانے والی رکاوٹوں کو پاش پاش کر دیا گیا۔ انسان کو مکمل آزادی حاصل ہوئی۔ ہر ایک خودی کی آنکھ کھلی۔ انسانی زندگی سے ظلمات کافور ہوئیں اور ایک نور کی مے سی پھوٹ بہی..... انسانی فکر کے گلستان میں بادِ صبا کے جھونکے آئے اور انسان خوشی ومسرت سے جھومنے لگا۔ انسان پر سے انسان کی خدائی کو مکمل طور سے ختم کرنے کی عدیم المثال کامیابی جس کتاب کے حصہ میں آئی اس کتاب کا نام ہے قرآن حکیم!

اس سے بڑھ کر حقوق انسانی کا منشور نوعِ انسانی نے کبھی نہیں دیکھا۔ میگنا کارٹا سے کہیں زیادہ، بہت عظیم، حقوقِ انسانی کا منشور اگر کوئی ہے تو یہ مصحفِ قرآن مجید ہے۔

اس منشور نے غلاموں کے ہاتھوں میں پڑی ہوئی زنجیروں کو توڑا۔ سارے ہی انسانوں کو ایک ہی صف میں مساویانہ

حقوق کے ساتھ لا کھڑا کیا۔ انسانی آزادی کا یہ منشور، روشنی کا یہ مینارہ سارے ہی انسانوں کو مخاطب کر کے یہ کہتا ہے:

''انسانو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔'' (الحجرات:۱۳)

اس تعلیم نے انسان کو بتایا کہ نوعِ انسانی ایک کنبہ ہے۔ ایک دوسرے کے پہچاننے کے لئے ہی قبیلے برادریاں اور خاندان بنے ہیں۔

☆ پیدائش کی بنیاد پر اونچ نیچ
☆ قبیلے کی بنیاد پر اونچ نیچ
☆ خاندان کی بنیاد پر اونچ نیچ

یہ سارے امتیازات بیخ و بُن سے اکھاڑ کر پھینک دیے گئے۔

سبھی انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور وہ سب مساویانہ حقوق اور مساویانہ زندگی کے مستحق ہیں، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانوں کو دوسروں کے اقتدار سے رہائی دلا کر اور مساویانہ حقوق عطا کر کے کیا قرآن نے انہیں بے لگام چھوڑ دیا؟ کیا انہیں سرکش بنا دیا؟ کیا انہیں ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا؟ نہیں، نہیں ہرگز نہیں!

قرآن نے خدا کا تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید و تلقین کی۔ صرف ایک خدا سے ڈرو اس کا حکم دیا۔ دوسروں سے نہ ڈرو۔ ان تعلیمات کو عطا کر کے خوفِ خداوندی دل میں جاگزیں کر کے صرف خدائی قوانین کے آگے سرنگوں ہونے کا حوصلۂ بلند قرآن نے انسان کو عطا کیا۔

ظالم حکمرانوں، غیر منصفانہ قوانین، استحصال کرنے والوں، جنگ، بیماری، موت، غربت و افلاس، مال و شہرت کا زیاں، ان تمام کے اندیشوں سے نہ ڈرنے اور نہ گھبرانے اور نہ ڈگمگانے کی تعلیم اور تربیت دے کر قرآن نے انسان کو ایک بہادر، باوقار، صاحبِ مجد و شرف ہستی بنایا۔ انسان کو ان عظیم نعمتوں سے مالا مال کرنے والی ایک ہی کتاب ہے اور وہ ہے قرآن مجید۔ صحرا کی گودوں میں پلنے والے عرب اپنے قبیلوں کی خانہ جنگی میں الجھے ہوئے تھے۔ اس وقت کی دنیائے انسانیت کی تہذیب کے جھونکے ان کے قدموں کو چھو کر بھی نہ گزرے تھے۔ اس کتابِ عظیم نے ایسی قوم کو سلیقہ و تہذیب سے آراستہ کر کے دنیا پر حکومت کرنے کی حکمت و دانش اور تدبیر سے نواز کر انہیں ہر اعتبار سے بہادروں کا بہادر بنا دیا۔

یہ عظیم کارنامہ درحقیقت قرآن کی انقلابی تعلیمات ہی کا نتیجہ ہے اور اس حقیقت کا اعلان بلا کسی تردد کے ہمالیہ کی چوٹیوں پر کھڑے ہو کر کرنے کے لئے میں تیار ہوں۔

اس کتاب مبین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر حالت میں انصاف و عدل پر قائم رہنے اور کبھی بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دینے کی تاکید اس نے ہر قدم پر کی ہے۔ حق و انصاف کا دامن چھوڑنے والے کو آخرت کے دردناک عذاب سے بھی ڈرایا ہے۔ آپ کے اپنے رشتہ دار کا معاملہ ہو تو بھی ان کی خاطر حق و انصاف کا دامن نہ چھوڑو۔ اس کی تاکید قرآن کرتا ہے۔ اسی عدل و انصاف کی تعلیم کا اثر ہے کہ اسلامی حکومت کے بے مثل حق و انصاف کے نمونے تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔

انسان کی آزادی، انسانی مساوات اور حق و انصاف ان تین بہترین اساسی اصولوں پر قرآن حکیم انسانی معاشرہ کو تشکیل

دیتا ہے۔

قرآن کا ایک اور امتیازی وصف ملاحظہ فرمائیں:

بہت سی مذہبی کتابیں انسان کی دنیوی زندگی کو پاپ کی زندگی کہتی ہیں، اس سے جلد از جلد دامن چھڑانے کی، اس کو تج دینے کی اور اس کو خیر باد کہنے کی تلقین کرتی ہیں۔

اس کے برخلاف قرآن یہ کہتا ہے کہ انسان خدا کی ایک بہترین تخلیق ہے۔ وہ زندگی میں انسانی فرائض کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ ان اعمال کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور زندگی میں ان اعمال کے سرانجام دینے کی پوری تاکید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان فرائض کی انجام دہی سے تمہیں کامل زندگی میسر آئے گی اور زندگی میں حسن کے چار چاند لگیں گے۔ انسانی زندگی کو احترام کی نگاہ اور تکریم کی نظر سے دیکھنے والی کتاب قرآن مجید ہے۔

وہ کارزارِ حیات سے فرار کی تلقین نہیں کرتی۔ بلکہ یہ کتاب کہتی ہے کہ زندگی کی اسی جدو جہد سے حیاتِ کامل انسان کو حاصل ہوتی ہے۔

☆ ایسے امتیازات سے معمور یہ کتاب لازماً 'الکتاب' ہے۔

☆ ایسی نعمتوں سے نوازنے والی یہ کتاب یقیناً مقدس کتاب ہے۔

☆ ایسی عظمتوں سے ہمکنار کرنے والی یہ کتاب بلا شک وریب عظیم کتاب ہے۔

☆☆☆

(بقیہ مکاتب و مدارس .....ص۵۱)

.....مسئلہ یہ ہے کہ زیرِ احسان رہ کر مدرسہ مقاصدِ مذکورہ کے حصول کی راہ پر ہرگز گامزن نہیں رہ سکتا۔ سرکار مدرسہ کے نظام ونصاب دونوں میں دخیل ہونا چاہتی ہے، جس کی خبریں آئے دن موصول ہوتی رہتی ہیں۔ ظاہر ہے، جب مدرسہ اس کے احسان کے بوجھ تلے دبا ہوگا تو پھر ان کو اسلامی نصاب ونظام میں دخل اندازی کرنے سے کوئی مانع ہی نہیں رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود بے سروسامانی کے، دینی مدارس ومکاتب، سرکاری امداد قبول نہیں کرتے۔

یہ بھی خیال رہے کہ بے زری ہرگز ناکامیابی کی علامت نہیں، اگر ایسا ہوتا تو صحابہ اپنے شکم پر ایک ایک پتھر اور خلاصۂ کائنات حضرت محمد ﷺ دو دو پتھر باندھ کر فقر واستغنا کا درس نہ دیتے۔ اصل کامیابی تو علمِ دین سے آراستہ ہونا اور دوسروں تک اس کی تبلیغ کرنا اور اسی جد وجہد میں مالکِ حقیقی سے جا ملنا ہے، نہ کہ مادی ساز وسامان سے حاصل ہونے والی لذتوں میں پڑ کر آخرت کو فراموش کر دینے میں۔

اب اخیر میں رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کو بھی بغور ملاحظہ فرمائیے، ارشاد فرماتے ہیں: تم عالم بنو، یا طالبِ علم بنو، یا علم توجہ سے سننے والے بنو، یا علم اور اہلِ علم سے محبت کرنے والے بنو، اور خبردار! ان چار کے علاوہ پانچویں نہ بنو، ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے۔ پانچویں قسم یہ ہے کہ تم علم اور اہلِ علم سے بغض رکھو۔ (مجمع الزوائد: حدیث: ٤٩٥، الطبرانی فی الأوسط (٥١٧١) والصغیر (٩/٢) والمصنف فی کشف الاستار (١٣٤)

اللہ پاک ہم سب کے ساتھ خیر وعافیت کا معاملہ فرمائے، اور علم وعمل سے نوازے۔ آمین یا رب العالمین

☆☆☆

تاریخ کے جھروکوں سے

مختصر تاریخ ثقافت اسلامی

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

یہ تحریر دراصل ''مختصر تاریخ ثقافت اسلامی'' پر تحریر کردہ راقم کا مقدمہ ہے، استاد محترم مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی دامت برکاتہم کی اس مفید و جامع اور مختصر کتاب کا راقم نے نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ اس پر تعلیقات وحواشی بھی لکھے پوری کتاب قسط وار شائع کی جا چکی ہے، تمہیدی و اختتامی سطریں حذف کر کے اب مقدمہ بھی قارئین کی نذر ہے۔ (مدیر)

ہماری ثقافت واقعی بے مثال، ہمارا ماضی یقیناً شاندار اور ہماری تہذیب فی الحقیقت ایسی لچکدار، وسعتوں کی حامل اور آسانیوں کے ساتھ دلکش اخلاقی اقدار پر مبنی ہے کہ اس نے جزیرۃ العرب سے نکل کر افریقہ کے جنگلوں میں بسنے والوں پر اپنے اثرات مرتب کیے، چین و ہندوستان میں بسنے والوں کو ایک نئے تمدن، ایک نئی زندگی اور ایک نئی روشنی سے آشنا کیا، اور اس لیے بھی دل نے قبول کیا کہ کتاب بڑی جامع اس اعتبار سے تھی کہ آج کل کے بالخصوص نوجوانوں اور بالعموم تمام لوگوں میں لمبی چوڑی کتابیں پڑھنے کا رواج ختم ہوتا جارہا ہے، یہ کتاب ایک مجلس میں ہی عظمت رفتہ اور مسلمانوں کے عہد عروج کی جھلک دکھانے کے لیے کافی تھی، بس پھر کیا تھا ایک دن ترجمہ کا کام شروع کیا، اور تمام ذہنی الجھنوں اور زندگی کے جھمیلوں کے باوجود کوئی ایک ماہ کی مدت میں ترجمہ مکمل ہوگیا، لیکن اسی دوران ذہن نے رہنمائی کی کہ کتاب میں بہت سے ایسے اشخاص اور مقامات کا ذکر ہے جو تاریخ کا روشن باب ہیں ، کیوں نہ بہت مختصر مگر معلوماتی تشریحی حواشی تحریر کر دیے جائیں، جن سے کم از کم قاری کو ایک اندازہ ہوجائے، کہ وہ جس قوم کا فرد اور پروردہ ہے وہ قوم ایک عالمی، انقلابی، دینی، فکری، صنعتی، تجارتی اور حکومتی جدت طرازیوں پر مشتمل ثقافت کی بانی ہے، تمام تر کوششوں کے باوجود وقت کی قلت دامن گیر رہی اور صرف ''ہندوستان کے اصحاب فضل وکمال پر ایک اجمالی نظر'' میں وارد اشخاص کے حواشی تیار ہو پائے، بہت سی دیگر شخصیات اور مقامات پر بھی حاشیے لکھے گئے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ رہ ہی گئے جو بہ توفیق خداوندی آئندہ پھر کبھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی تاریخ سے واقف نہ ہو تو وہ معروضی انداز اپناتا ہے، احساس کمتری میں مبتلا ہوتا ہے، عجیب عجیب سوالات اسکے ذہن کو پریشان کرتے ہیں، ہر نئی چیز آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے، وہ ہر نئی تہذیب کے سیلاب میں بہہ جانے والا تنکا بن جاتا ہے، اپنی قوم، اپنے مذہب اور اپنی قیادت ہی نہیں اپنی صلاحیت سے بھی اس کا اعتماد اٹھ جاتا ہے،

لیکن اگر تاریخ کا علم ہے اور تاریخ میں خاص اپنے کردار سے واقفیت حاصل ہے تو پھر اسباب ناکامی کی تلافی کا باعث بن سکتا ہے، اور مستقبل میں روشنی کا منارہ ثابت ہوسکتا ہے، اور کم ازکم یہ کہ دوسروں کی تہذیب وثقافت سے قطعاً مرعوب ہوئے بغیر اپنی ثقافت کو دوسروں کے سامنے پورے وثوق کے ساتھ پیش کرسکتا ہے۔

آج کا نوجوان تہذیب جدید کی تجلیات کو ترقی کی معراج سمجھتا ہے اس لیے کہ اس کو اپنی تہذیب وثقافت کا علم نہیں ورنہ وہ جس امت کا فرد ہے اس امت کو امتیازی شان عطا کی گئی ہے، اس کو وہ عقیدہ دیا گیا جو عقیدہ باعث رحمت، وحدانیت پر مبنی اور اتحاد ومساوات کا داعی ہے، اس عقیدے کے متبعین نے عظمت وشرافت، احترام وتوقیر، عبادت وریاضت، تجارت وصناعت، روحانیت واعلیٰ انسانی اقدار، اخلاقی ومعاشرتی، اقتصادی وسیاسی، تعلیمی وتعمیری ترقیوں کی وہ مثال قائم کی ہے کہ تاریخ انسانی اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

جو ضخیم کتابیں اس موضوع کا احاطہ کرتی ہیں انھیں پڑھ کر مورخین کے صحیح موقف اور معترضین کی دھاندلیوں کے علاوہ اپنے اسلاف کے کارہائے نمایاں کا پتہ ملتا ہے اور یہ احساس پختہ تر ہوتا چلا جاتا ہے کہ اس دین کو اللہ نے پھلنے پھولنے کے لیے ہی آنحضرت کے ذریعہ اس دنیا میں اتارا ہے، یہ ماضی میں جس طرح دنیا کے سبزہ زار بن جانے کا سبب بنا اگر یوں ہی کوششیں ہوتی رہیں تو مستقبل میں بھی اسلامی ثقافت کے دامن امن میں سارا عالم پناہ لے گا۔

تاریخی شواہد کی بنیاد پر ہماری ثقافت یقیناً اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس نے ہر کسی کو گلے سے لگایا، ہر کسی کی قدر افزائی کی ہے، صناعت وسخاوت، تعلیم وتعلم اور نفع رسانی میں کبھی کوئی امتیاز نہیں برتا گیا، عہد اسلامی کے زریں دور کے مدارس میں تعلیم کا حصول سب کے لیے مفت اور دروازہ سب کے لیے کھلا تھا، کتب خانوں اور اسپتالوں سے سب مستفید ہوا کرتے تھے، حکومتیں سب کی یکساں سرپرستی کیا کرتی تھیں، اسلامی ثقافت کے سایے میں رہنے والے اس تہذیب کے امن وسکون، عدل ومساوات غمخواری وجذبۂ نصرت کی قسمیں کھایا کرتے تھے، مسلمانوں کی وسعت ظرفی اور وسیع القلبی اور رحمدلی دین اسلام میں داخل ہونے کا باعث ہوجایا کرتی تھی۔

مشہور مستشرق ڈاکٹر گستاؤلی بان (Dr.Gustave Lebon) نے اپنی کتاب تمدن عرب (۱) خوب اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں نے جہاں بھی فتح حاصل کی اور ان کی حکومت قائم ہوئی وہاں کے باشندوں کو پوری آزادی دی اور انھیں آسودگئ حال سے ہمکنار کرنے کے ساتھ ترقیات کا ایک حصہ بننے کا اہل بنایا، شام جس میں بیت المقدس بھی شامل تھا وہاں عیسائیوں کی خاصی تعداد بستی تھی، عربوں کی وہاں حکومت قائم ہونے کے بعد حالات کیسے بدلے اور وہاں کے بلاتفریق مذہب بسنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا، اس مستشرق کی زبانی سنیے، وہ لکھتا ہے: ''عربوں کی حکومت میں رہ کر شام نے

(۱)۔ یہ مشہور کتاب اصلا فرنچ میں لکھی گئی مختلف زبانوں میں مثلاً عربی، فارسی اور اردو میں اس کا ترجمہ ہوا، عربی میں حضارۃ العرب کے نام سے عادل زعیتر کا ترجمہ مقبول ہوا، فارسی میں سید محمد تقی فخر داعی نے ترجمہ کیا، اور اردو میں تمدن عرب کے نام سے نواب سید علی بلگرامی نے ترجمہ کیا

وہ سرسبزی حاصل کرلی جو سال ہائے دراز سے مفقود ہوگئی تھی، خلفاء بنی امیہ وعباسیہ کے زمانے میں شام کا تمدن ایک اعلیٰ درجہ پر پہنچ گیا، عربوں نے اپنی رعایا کے ساتھ نہایت انصاف اور انسانیت سے برتاؤ کیا، اور ان کو پوری آزادی مذہب کی دی، ان کے عہد حکومت میں کلیسۂ مشرقی اور مغربی دونوں کے رئیس الاساقفہ کو اس قدر آرام ملا جو انھیں اس وقت تک ہرگز نصیب نہ ہوا تھا، شام کے تمام بڑے شہر بیت المقدس ،صیدون، دمشق ،صور بہت ہی سرسبز ہوگئے اور حرفت اور فلاحت نے بے انتہا ترقی کی''۔(۱)'

یہ تو ایک سرسری سی عبارت ہے نہ جانے اس طرح کے کتنے اعترافات اور کتنے دلائل ہیں جن کو اگر یکجا کردیا جائے تو ضخیم کتاب مرتب ہوجائے، Gibbon, Hamilton Gibb, Hegel, Renault, Wilfred Contwell smith, Victor Hugo, Renou louis,اور بے شمار مستشرقین و یورپی مصنفین نے اس طرح کے اعترافات کیا ہے۔

اسلامی ثقافت کے علمبرداروں نے شام ،مصر، بلاد افریقہ، ایران ،عراق ، ہندوستان ، اندلس، سسلی، اٹلی اور فرانس ، وغیرہ جہاں بھی قدم رکھا تو صرف فوجی غلبہ وتسلط پر اکتفا نہیں کی بلکہ وہاں کی عوام وباشندگان کے دلوں پر حکمرانی کی، ان کے دلوں کو فتح کرکے انھیں اپنا بنایا اور اس طرح اسلام کے آفاقی پیغام کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچایا، جہاں ایک طرف انھوں نے میدان جنگ جیتا تو دوسری طرف دلوں کی فتح سے اپنی تہذیب کے اثرات کو رائج کیا، علمی تحریک برپا کی، متعدد ایسے شہر آباد کیے جن میں شہری ضروریات اور تمدنی ترقیات کے تمام نمونے موجود تھے، تعلیم کے لیے مدارس، حفظان صحت کے لیے اسپتال ، ذوق مطالعہ کو فروغ دینے کے لیے جگہ جگہ کتب خانے قائم کیے، نئی نئی چیزوں کی دریافت کی، دنیا کو وہ کچھ عطا کیا جو ترقی یافتہ اقوام کے یہاں متعارف تک نہ تھا، آج کا ترقی یافتہ یورپ جب تاریخ کے تاریک ترین دور میں دھکے کھاتا پھر رہا تھا تو مسلمان کہیں تہذیبی جلوے بکھیر رہے تھے، اور کہیں علوم وفنون کی ترویج واشاعت کی بے مثال داستانیں رقم کررہے تھے، حرفت وصنعت کے کارخانے قائم کررہے تھے، طب و زراعت ، ریاضی وھیئت، فلسفۂ وفلکیات، طبعیات و معدنیات میں توایسی یافت کی آج بھی دنیا ترقی کے تمام مدارج طے کرلینے کے بعد ان ہی بنیادوں پر قائم ہے، جو اس عہد کی ایجادات تھیں جب کہ یورپ علم کی (ع) سے بھی واقف نہ ہوسکا تھا، نقاشی وسنگ تراشی اور فن تعمیر (Civi Engeenering)میں مسلمان معراج کمال تک جا پہنچے تھے کہ ان کے تعمیری عجائبات کے تذکرے سے ہی ایک دلکش تاریخ مرتب ہوسکتی ہے۔

مسلمانوں کو تعمیر وترقی اور علم سے بڑا شغف تھا، انھوں نے علمی کتب خانوں کی ترتیب و آرائش اور حسنِ انتظام اور کتابوں کی حرص کے ساتھ، مراکز کے قیام، طلبہ علم کی سرپرستی، علماء ادباء، شعراء، فلاسفہ، متکلمین اور فنکاروں ،مصوروں ، کاریگروں ، پیشہ وروں اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین کے

(۱)۔تمدن عرب:ص۲۳۵ مترجم علی بلگرامی۔

ساتھ جو حسن سلوک کیا اس کی مثال ملنی مشکل ہے ،ڈاکٹر گستاؤلیبان کا اعتراف ملاحظہ کیجئے ''عربوں نے جو مستعدی تحصیل علم میں ظاہر کی وہ فی الواقع حیرت انگیز ہے، اس خاص امر میں بہت سی اقوام ان کے برابر ہوئی ہیں لیکن بمشکل کوئی ان سے بازی لے جاسکی۔''(۱)

ایک اور منصف مزاج مستشرق ڈریپر (Draper) لکھتا ہے کہ ''یہ یورپین ادب یہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے متعلق ہمارے جو علمی فرائض ہیں ان کو ہم بھلادیں لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ان کو پہنچانیں اور یہ ناانصافی جو مذھبی عناد اور قومی جہالت ووحشت پر مبنی ہے ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی''(۱)

لافیس اور رامبور(Lavisse et Rambaurd) کی تاریخ عام کی سطریں ملاحظہ کیجئے کہ ''جب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہر قوم کے کارناموں کا ذکر کریں تو پھر کسی منصف مزاج کے لیے اس کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ وہ عربوں کے کارناموں کا انکار کرے جو دوسری قوموں کے کارناموں سے زیادہ ہیں، انھوں نے افریقہ، ایشیا اور لاتینی یورپ کی جاہل قوموں میں صرف مشرق قریب اور مشرق بعید کی صنعتوں اور ایجادات و اختراعات ہی کو نہیں پہچانا بلکہ ہر ملک وقوم کے پراگندہ مواد کو چن کر ان سے بہترین طریقہ سے کام لیا اور یہ مختلف مواد آپس میں مل جل کر ایک قالب میں ڈھل گئے جس سے عربوں نے ایک زندہ تہذیب پیدا کی جن پر ان کے مذاق اور فطرت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے، اس میں ایک خاص قسم کی وحدت اور عمدہ صفات تھیں۔''(۲)

یورپ کی جہالت اور پھر اس کی ترقی اور ثقافت اسلامی کے اس پر بھرپور اثرات پر بڑا مختصر اور جامع تبصرہ کرتے ہوئے اور اس کی ترقی کو عربوں کی مرہون منت مانتے ہوئے لٹیری نے لکھا ''اگر عرب تاریخ سے نکال دئے جاتے تو یورپ علمی ترقی میں صدیوں کے لیے پچھڑ جاتا''(۳)۔

یہ بھی تاریخ کا المیہ ہے کہ دوسروں نے ہماری تاریخ کو مسخ کرنے کا کام خوب کیا لیکن ہم خود بھی اپنی نسلوں کو صحیح چیزیں بہم نہ پہنچا سکے، جس کا نتیجہ ہے کہ آج بڑا طبقہ ہمارے حکمرانوں کو بڑی قبیح نظروں سے دیکھتا ہے، اور ان کے متعلق وہی تاثر قائم کرتا ہے جو خیانت پسند مورخوں کی دین ہے، ورنہ ہماری تاریخ میں ایسے بھی انمول اور بیش بہا ہیرے ہیں کہ انھوں نے علم کے فروغ کی حرص، ملکی وقومی ترقی کے شوق اور رعایا کو آرام پہنچانے کے اشتیاق میں اپنی مثال نہیں چھوڑی، جب روم پر مامون رشید کو غلبہ حاصل ہوا تو تاریخ کی یہ بھی بڑی شاندار اور منفرد روایت ہے کہ شرائط صلح میں اس نے ایک شرط یہ بھی رکھی کہ ان کے یہاں جو علمی خزانہ ہے اس کو نقل وترجمہ کرنے کی ان علماء کو مکمل اجازت ہوگی جو خلیفہ کی جانب سے بھیجے جائیں گے، نصف دنیا پر محیط اقتدار کا نشہ بھی علمی ذوق کو زیر نہ کرسکا ،اور فتح وکامرانی کے وقت بھی یہ خیال رہا کہ اپنی قوم کو علم سے بہرہ ور کیا جائے ،خود ہندوستان میں جس طرح مسلم بادشاہوں

(۱)۔تمدن عرب، مترجم سید علی بلگرامی ص:۴۸۴۔

(۲)۔اسلام اور عربی تمدن، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص:۲۰۴، دارالمصنفین ۔یہ کتاب محمد کرد علی کی ''الاسلام والحضارۃ العربیۃ'' کا ترجمہ ہے جو کہ اسلامی تہذیب وتمدن کے اثرات واحسانات کے ذکر اور دشمنوں کے اعتراضات پر مشتمل بڑی اہم کتاب ہے۔(طارق)

(۳)۔ایضا(ص:۲۱۹) ۳۔تمدن عرب، ص:۴۸۴۔

نے علماء کی سر پرستی کی، علم کی قدر کی، مدارس وعلمی مراکز قائم کیے، جگہ جگہ پر مساجد تعمیر کیں، لب سڑک اور بستیوں کے درمیان کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اس دور کی تعمیر کردہ کوئی عظیم الشان مسجد نہ ہو، یہ از خود ان حکمرانوں کے تعمیری ذوق کی دلیل ہے۔

درحقیقت دین اسلام ایک مکمل دین ہے، اور قیامت تک کے لیے آخری دستور حیات ہے، اسی لیے اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو انسانی زندگی کی تکمیل وتعمیر اور امن وسکون فراہم کرنے کا ذریعہ بن سکیں، اسلام کا یہ امتیاز ہے کہ وہ جس چیز سے روکتا ہے اس کا بدل پیش کرتا ہے ورنہ اس چیز کے مقصد کو بدل کر اس کا دھارا موڑ دیتا ہے، ثقافت اسلامی کی یہی خصوصیت سب سے اہم ہے کہ اس کی وسعتیں زمان ومکان کی حدود کی پرواہ کیے بغیر بے شمار ملکوں اور قوموں کو اپنی آغوش عدل ومساوات میں سمیٹتی چلی گئیں اور ہر میدان میں اسلامی رنگ بھر دیا، علم وادب، سیاست وحکومت صناعت وکاریگری اور حرفت وتعمیر سب کو اسلامی رنگ دے دیا، اپنے اثرات سب پر نقش کر دیے لیکن دوسروں کے اثرات وعوامل کو اسلامی رنگ میں رنگ دیا، ثقافت اسلامی کی تعمیری صلاحیت نے خود یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں بڑا کردار ادا کیا ہے، یورپ کی اخلاقی حالت پر ثقافت اسلامی کی مذھبی رواداری کی چھاپ خوب نظر آتی ہے، اس کی علمی ترقی پر تو ہماری ثقافت کے اثرات ایسے گہرے ہیں کہ لاکھ بغض و عناد کے بعد بھی اس سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں، گستاؤ لیبان کے مطابق کہ ''وہ یونانی زبان کا نام بھی نہ جانتے تھے مگر عربوں کی بدولت یونان کا علمی خزانہ ان تک منتقل ہوا۔''(۱)

دنیا کی بہت سی اقوام اور ان کی تہذیب وثقافت نے غلبہ حاصل کیا مگر جو کام مسلمانوں نے کیا وہ نہ ایرانی کر سکے اور نہ رومی ویونانی، اگر چہ ان کا تسلط کتنا بھی پرزور رہا مگر دیگر اقوام پر ان کے اثرات بہت کم رہے، مسلمانوں کی عربی اسلامی ثقافت کو دنیا کی بیشتر اقوام نے بیشتر مقامات پر نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کے فروغ وترقی کا جزء لاینفک بن گئے ترکوں اور مغلوں بربر اور تاتاریوں کی تاریخ اس کی بہترین مثال ہے مختصر یہ کہ مسلسل زوال کے بعد بھی تہذیب اسلامی کے اثرات کو مٹانا تو دور! دنیا انکار کرنے پر بھی قادر نہ ہو سکی، ایک مخصوص ذہنیت کی ہٹ دھرمی سے حقائق کا مٹ جانا یوں بھی ممکن نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ہماری ثقافت وتہذیب ایسی ہے کہ ہر آن اس پر فخر کیا جائے اور اس کی ترویج وترقی کے ذرائع سے از سر نو بحث کی جائے اور نئی نسل کا اس پر اعتماد بحال کیا جائے کہ آج کی بیشتر ترقیات کی بنیاد تمدن اسلام کے دور عروج کی ایجادات ہیں، آج کی تعمیرات اُس دور کی تعمیرات کا مقابلہ نہ راحت رسانی میں کر سکتی ہیں نہ مضبوطی اور حسن وشوکت میں، جسکی جھلکیاں درون کتاب نظر آئیں گی، اس دور ترقی میں میڈیکل کالجز کا نظام نا واقفوں کے لیے نیا ہو تو ہو، مگر یہ ساری چیزیں ہماری ثقافت کا حصہ تھیں، دواؤں اور حکمتوں کی دریافت وایجاد کے ساتھ ایسا نظام تشخیص وعلاج کہ عقل حیران رہ جائے، کتب خانوں میں کتابوں کی فراہمی و فراوانی اور حسن انتظام کی ایسی مثالیں کہ آدمی اُس عہد کا اِس دور ترقی سے موازنہ کرنے لگے۔

۱۔تمدن عرب: ص:۶۰۰۔

اس کتاب کا مقصد یہی ہے کہ کم وقت اور مختصر مطالعہ سے اپنی ثقافت کی جھلک اور چاشنی مل جائے تو مفصل کتابوں تک رسائی بہت آسان ہوجائے گی اور مجھے یقین کامل ہے کہ ذات باری نے اس کتاب کو اگر چنگاری شوق کو ہوا دینے کا ذریعہ بنادیا اور پھر اس صاحب شوق نے اس موضوع پر مفصل مطالعہ کیا تو اسباب زوال کو درس عبرت سمجھ کر نتائج اخذ کرتے ہوئے مستقبل میں وہ ثقافت اسلامی کی کرنیں بکھیرتا ہوا سورج ہوگا جو اپنی روشنی سے ہر موافق ومخالف کو نفع پہنچائے گا۔

مختصر یہ کہ اس تہذیب انقلابی بنیاد ذات اقدس سراپا تقدس حضرت محسن انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی تھی، یہ تمنا جو میرے لیے اس کتاب کو پیش کرنے کی تحریک بنی ہر اس دل کی تڑپ ہے جسے اپنے مذہب اور اپنی تہذیب و ثقافت، اپنے اسلاف کی وراثت اور اسلام کی شان وشوکت سے قلبی لگاؤ ہے کہ کاش یہ آنکھیں اس شوکت کو بحال ہوتا دیکھ سکیں۔ جس کی بشارت قرآن دیتا ہے اور جس کی داستان کتابیں سناتی ہیں، کاش یہ سطریں بھی کچھ ہی نفوس میں صحیح مگر اسلام اور اس کی تعمیری اور قائدانہ صلاحیتوں پر اعتماد بحال کرنے اور اس کی طرف متوجہ کرنے کا سبب بن جائیں۔ میں گرامی قدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کا ہر طرح شکرگزار ہوں کہ انھوں نے تمام تر مشغولیات کے باوجود کلمات تبریک لکھ کر قدر افزائی وحوصلہ افزائی فرمائی، اسی طرح میں انتہائی ممنون ومشکور ہوں مولانا عمیر الصدیق ندوی دریابادی صاحب کا کہ ان کی گراں قدر وحوصلہ افزا تحریر سے نہ صرف مجھے حوصلہ ملا بلکہ وہ ایک خوبصورت اضافہ ہوگئی، حوصلہ افزائی اور خورد نوازی کے ساتھ ان کی منکسر المزاجی ان کا ایسا وصف ہے جس کی نظیر ملنی بہت مشکل ہے۔

☆☆☆

يـأيها الذين آمنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون..... شهر رمضان الذي أنزل فيه القرآن هدى للناس وبينٰت من الهدى والفرقان، فمن شهد منكم الشهر فليصمه. (سورہ بقرہ)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کردئے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے، اس سے توقع ہے کہ تم میں تقوی کی صفت پیدا ہوگی۔.....رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لئے سراسر ہدایت ہے، اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہے، لہذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے اس لو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے (تفہیم القرآن)

رمضان المبارک

آداب رمضان

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

ماہ رمضان کی فضیلت:

شهر رمضان الذی أنزل فیه القرآن هدی للناس وبینات من الهدیٰ والفرقان

''ماہ رمضان ہے جس میں قرآن مجید بھیجا گیا، جس کا وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے (ذریعہ) ہدایت ہے اور واضح الدلالت ہے، منجملہ ان کتب کے جو (ذریعہ) ہدایت (بھی) اور (حق وباطل میں) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں۔''

حدیث: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جب رمضان داخل ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے جنت کے دروازے اور ایک روایت میں ہے کہ رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور جہنم کے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ اور شیاطین پابندِ سلاسل کردئے جاتے ہیں (بخاری، مسلم)

اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم پر رمضان کا مبارک مہینہ آیا۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر اس کا روزہ فرض کیا ہے، اس میں آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ اور دوزخ کے دروازے بند کردئے جاتے ہیں۔ اور سرکش شیطان قید کردیئے جاتے ہیں۔ اس میں اللہ کی (جانب سے) ایک ایسی رات (رکھی گئی) ہے جو ہزاروں مہینوں سے بہتر ہے، جو شخص اس کی خیر سے محروم رہا وہ محروم ہی رہا (احمد نسائی، مشکوۃ)

اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب رمضان کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیاطین اور سرکش جن قید کر لئے جاتے ہیں، اور دوزخ کے دروازے بند کردئے جاتے ہیں، پس اس کا کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا۔ اور جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں پس اس کا کوئی دروازہ بند نہیں رہتا اور ایک منادی کرنے والا (فرشتہ) اعلان کرتا ہے کہ اے خیر کے تلاش کرنے والے! آگے آ۔ اور اے شر کے تلاش کرنے والے! رک جا۔ اور اللہ کی طرف سے بہت سے لوگوں کو دوزخ سے آزاد کردیا جاتا ہے، اور رمضان کی ہر رات میں یہی ہوتا ہے۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مشکوۃ)

حدیث: حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شعبان کے آخری دن ہمیں خطبہ دیا۔ اس میں فرمایا۔ اے لوگو! تم پر ایک بڑی عظمت والا، بڑا بابرکت مہینہ آرہا ہے۔ اس میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینے سے بہتر ہے، اللہ تعالیٰ نے تم پر اس کا روزہ فرض کیا ہے۔ اور اس کے

قیام (تراویح) کو نفل (یعنی سنت مؤکدہ) بنایا ہے، جو شخص اس میں کسی بھلائی کے (نفلی) کام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرے وہ ایسا ہے کہ کسی نے غیر رمضان میں فرض ادا کیا۔ اور جس نے اس میں فرض ادا کیا وہ ایسا ہے کہ کسی نے غیر رمضان میں ستر فرض ادا کئے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے، اور صبر کا ثواب جنت ہے۔ اور یہ ہمدردی وغمخواری کا مہینہ ہے۔ اس میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ اور جس نے اس میں کسی روزے دار کا روزہ افطار کرایا۔ تو وہ اس کے لئے اس کے گناہوں کی بخشش اور دوزخ سے اس کی گلوخلاصی کا ذریعہ ہے اور اس کو بھی روزے دار کے برابر ثواب ملے گا۔ مگر روزے دار کے ثواب میں ذرا بھی کمی نہ ہوگی۔ ہم نے عرض کیا! یا رسول اللہ ہم میں سے ہر شخص کو وہ چیز میسر نہیں جس سے کہ روزہ افطار کرائے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی عطا فرمائیں گے جس نے پانی ملے دودھ کے گھونٹ، یا ایک کھجور یا پانی کے ایک گھونٹ سے روزہ افطار کرادیا۔ اور جس نے روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھلایا پلایا اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض (کوثر) سے ایسا پلائیں گے کہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ جنت میں داخل ہوجائے۔ (اور جنت میں بھوک پیاس کا سوال ہی نہیں) یہ ایسا مہینہ ہے کہ اس کا پہلا حصہ رحمت، درمیانی حصہ بخشش اور آخری حصہ دوزخ سے آزادی کا ہے۔ اور جس نے اس مہینے میں اپنے غلام اور نوکر کا کام ہلکا کیا اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرمائیں گے، اور اسے دوزخ سے آزاد کردیں گے (بیہقی، شعب الایمان، مشکوۃ)

حدیث: حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے خود سنا ہے کہ رمضان آچکا ہے۔ اس میں جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور دوزخ کے دروازے بند ہوجاتے ہیں اور شیاطین کو طوق پہنا دیئے جاتے ہیں۔ ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو رمضان کا مہینہ پائے اور پھر اس کی بخشش نہ ہو، جب اس مہینے میں بخشش نہ ہوئی تو کب ہوگی۔ (طبرانی، اوسط، ترغیب)

حدیث: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جس نے ایمان کے جذبے اور طلب ثواب کی نیت سے رمضان کا روزہ رکھا اس کے گزشتہ گناہوں کی بخشش ہوگئی۔ (بخاری ومسلم، مشکوۃ)

حدیث: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ نیک عمل جو آدمی کرتا ہے تو (اس کے لئے عام قانون یہ ہے کہ) نیکی دس سے لے کر سات گنا تک بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ مگر روزہ اس قانون سے مستثنیٰ ہے کہ (اس کا ثواب ان اندازوں سے نہیں عطا کیا جاتا) کیوں کہ وہ میرے لئے ہے اور میں خود ہی اس کا (بے حد وحساب) بدلہ دوں گا (اور روزے کے میرے لئے ہونے کا سبب یہ ہے کہ) وہ اپنی خواہش اور کھانے پینے کو محض میری رضا کی خاطر چھوڑتا ہے۔ روزے دار کے لئے دو فرحتیں ہیں۔ ایک فرحت افطار کے وقت ہوتی ہے اور دوسری فرحت اپنے رب سے ملاقات کے وقت ہوگی۔ اور روزہ دار کے منہ کی بو (جو خلوِ معدہ سے آتی ہے) اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک وعنبر سے زیادہ خوشبودار ہے۔ الخ۔ (بخاری ومسلم، مشکوۃ)

حدیث: عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ روزہ اور قرآن بندے کی شفاعت کرتے ہیں (یعنی قیامت کے دن کریں گے) روزہ کہتا ہے۔ اے رب! میں

نے اس کو دن بھر کھانے پینے سے اور دیگر خواہشات سے روکے رکھا۔ لہذا اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرمائیے۔اور قرآن کہتا ہے کہ میں نے اس کو رات کی نیند سے محروم رکھا (کہ رات کی نماز میں قرآن کی تلاوت کرتا تھا) لہذا اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرمائیے۔ چنانچہ دونوں کی شفاعت قبول کی جاتی ہے۔(بیہقی، شعب الایمان، مشکوۃ)

حدیث: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ شعبان کی تاریخوں کی جس قدر نگہداشت فرماتے تھے اس قدر دوسرے مہینوں کی نہیں (کیونکہ شعبان کے اختتام پر رمضان کے آغاز کا مدار ہے) پھر رمضان کا چاند نظر آنے پر روزہ رکھتے تھے اور اگر مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے ۲۹ رشعبان کو چاند نظر نہ آتا تو تیس دن پورے کر کے پھر روزہ رکھتے تھے۔(ابوداؤد، مشکوۃ)

حدیث: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ رمضان کی خاطر شعبان کے چاند کا اہتمام کیا کرو۔(ترمذی، مشکوۃ)

سحری کھانا

حدیث: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ سحری کھالیا کرو۔ کیوں کہ سحری کھانے میں برکت ہے(بخاری و مسلم، مشکوۃ)

حدیث: عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمارے اور اہل کتاب کے روزے کے درمیان سحری کھانے کا فرق ہے (کہ اہل کتاب کو سو جانے کے بعد کھانا پینا ممنوع تھا اور ہمیں صبح صادق طلوع ہونے سے پہلے تک اس کی اجازت ہے۔)(مسلم، مشکوۃ)

غروب کے بعد افطار میں جلدی کرنا

حدیث: حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لوگ ہمیشہ خیر پر رہیں گے جب تک (غروب کے بعد) افطار میں جلدی کرتے رہیں گے۔ (بخاری و مسلم، مشکوۃ)

حدیث: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ دین غالب رہے گا جب تک کہ لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے۔ کیوں کہ یہود و نصاریٰ تاخیر کرتے ہیں۔(ابوداؤد، ابن ماجہ، مشکوۃ)

حدیث: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ مجھے سب سے زیادہ محبوب وہ بندے ہیں جو افطار میں جلدی کرتے ہیں۔ (ترمذی، مشکوۃ)

روزہ کس چیز سے افطار کیا جائے

حدیث: سلمان بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جب تم میں کوئی شخص روزہ افطار کرے تو کھجور پر افطار کرے۔ کیوں کہ وہ برکت ہے۔ اگر کھجور نہ ملے تو پانی پر افطار کرے کیوں کہ وہ پاک کرنے والا ہے۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی، مشکوۃ)

حدیث: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز مغرب سے پہلے روزہ افطار کرتے تھے تازہ کھجوروں پر، اگر تازہ کھجوریں نہ ہوتیں تو خشک خرما کے چند دانوں پر۔ اگر وہ میسر نہ آتے تو پانی کے چند گھونٹ پی لیتے۔(ابوداؤد، ترمذی، مشکوۃ)

حدیث: ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ جب

روزہ افطار کرتے تو فرماتے۔ ذھب الظمأ وابتلت العروق وثبت الاجر انشاء الله۔

"پیاس جاتی رہی۔ انتڑیاں تر ہوگئیں اور اجر انشاء اللہ ثابت ہوگیا"

حدیث: حضرت معاذ بن زہرہؓ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ روزہ افطار کرتے تو یہ دعا پڑھتے۔ اللھم لك صمت وعلى رزقك افطرت۔

اے اللہ! میں نے تیرے لئے روزہ رکھا اور تیرے رزق پر افطار کیا۔ (ابوداؤد، مرسلا، مشکوۃ)

حدیث: حضرت عمر بن خطابؓ سے آنحضرت ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا کہ رمضان میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا بخشا جاتا ہے۔ اور اس مہینے میں اللہ تعالیٰ سے مانگنے والا بے مراد نہیں رہتا۔ (طبرانی، اوسط، بیہقی، اصبہانی، ترغیب)

حدیث: ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ بے شک رمضان کے ہر دن رات میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بہت سے لوگ (دوزخ) سے آزاد کئے جاتے ہیں اور ہر مسلمان کی دن رات میں ایک دعا قبول ہوتی ہے۔ (بزار، ترغیب)

حدیث: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ تین شخصوں کی دعا رد نہیں ہوتی۔ (۱) روزے دار کی، یہاں تک کہ افطار کرے (۲) حاکم عادل کی، (۳) اور مظلوم کی۔ اللہ تعالیٰ اس کو بادلوں سے اوپر اٹھا لیتے ہیں۔ اور اس کے لئے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور رب تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میری عزت کی قسم! میں ضرور تیری مدد کروں گا۔ خواہ کچھ مدت کے بعد کروں۔ (احمد، ترمذی، ابن حبان، مشکوۃ، ترغیب)

اور ایک روایت میں ہے: تین شخص ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ حق ہے کہ ان کی دعا رد نہ فرمائے۔ (۱) روزے دار، یہاں تک کہ وہ افطار کرے، (۲) مظلوم، یہاں تک کہ وہ بدلہ لے لے، (۳) مسافر، یہاں تک کہ سفر سے لوٹ آئے۔ (بزار، ترغیب)

حدیث: حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ روزے دار کی دعا افطار کے وقت رد نہیں ہوتی۔ اور حضرت عبداللہ افطار کے وقت یہ دعا کرتے تھے۔ "اے اللہ! میں آپ سے سوال کرتا ہوں آپ کی اس رحمت کے طفیل جو ہر چیز پر حاوی ہے کہ میری بخشش فرما دیجئے۔ (بیہقی، ترغیب)

رمضان کا آخری عشرہ

حدیث: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں ایسی عبادت ومحنت کرتے تھے جو دوسرے اوقات میں نہیں ہوتی تھی۔ (بخاری، مسلم، مشکوۃ)

حدیث: حضرت عائشہؓ ہی سے روایت ہے کہ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو آنحضرت ﷺ شب بیدار رہتے اور اپنے گھر کے لوگوں کو بھی بیدار رکھتے۔ (بخاری ومسلم، مشکوۃ)

لیلۃ القدر

حدیث: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رمضان مبارک آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ بے شک یہ مہینہ تم پر آیا ہے۔ اور اس میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ جو شخص اس رات سے محروم رہا وہ ہر خیر سے محروم رہا۔ اور اس کی

خیر سے کوئی شخص محروم نہیں رہے گا۔ سوائے بدقسمت اور حرمان نصیب کے۔ (ابن ماجہ، واسنادہ حسن، انشاءاللہ، ترغیب)

حدیث: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا۔ لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ (صحیح بخاری، مشکوۃ)

حدیث: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب لیلۃ القدر آتی ہے تو جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کی ایک جماعت کے ساتھ نازل ہوتے ہیں۔ اور ہر بندہ جو کھڑا یا بیٹھا اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہو (اس میں تلاوت، تسبیح و تہلیل اور نوافل سب شامل ہیں۔ الغرض کسی طریقے سے ذکر وعبادت میں ہو) اس کے لئے دعائے رحمت کرتے ہیں۔ (بیہقی، شعب الایمان، مشکوۃ)

لیلۃ القدر کی دعا

حدیث: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ فرمایئے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ یہ لیلۃ القدر ہے تو کیا پڑھا کروں فرمایا: یہ دعا پڑھا کر۔ اللھم انك عفو تحب العفو فاعف عنی.

اے اللہ! آپ بہت معاف کرنے والے ہیں معافی کو پسند فرماتے ہیں۔ پس مجھ کو بھی معاف کر دیجئے۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مشکوۃ)

بغیر عذر کے رمضان کا روزہ نہ رکھنا

حدیث: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جس شخص نے بغیر عذر اور بیماری کے رمضان کا ایک روزہ بھی چھوڑا تو خواہ ساری عمر روزے رکھتا رہے وہ اس کی تلافی نہیں کر سکتا۔ (یعنی دوسرے وقت میں روزہ رکھنے سے اگرچہ فرض ادا ہوجائے گا۔ مگر رمضان مبارک کی برکت وفضیلت کا حاصل کرنا ممکن نہیں) (احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ، دارمی)

رمضان کے چار عمل

حضرت سلمان فارسیؓ آنحضرت ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ رمضان مبارک میں چار چیزوں کی کثرت کیا کرو۔ دو باتیں تو ایسی ہیں کہ تم ان کے ذریعہ اپنے رب کو راضی کرو گے اور دو چیزیں ایسی ہیں کہ تم ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ پہلی دو باتیں جن کے ذریعہ تم اللہ تعالیٰ کو راضی کرو گے یہ ہیں ''لا الٰہ الا اللہ'' کی گواہی دینا اور استغفار کرنا اور دو چیزیں جن سے تم بے نیاز نہیں۔ یہ ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرو۔ اور جہنم سے پناہ مانگو۔ (ابن خزیمہ، ترغیب)

تراویح

حدیث: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جس نے ایمان کے جذبے سے اور ثواب کی نیت سے رمضان کا روزہ رکھا اس کے پہلے گناہ بخش دیئے گئے۔ اور جس نے رمضان کی راتوں میں قیام کیا۔ ایمان کے جذبے اور ثواب کی نیت سے اس کے گزشتہ گناہ بخش دیئے گئے۔ اور جس نے لیلۃ القدر میں قیام کیا ایمان کے جذبے اور ثواب کی نیت سے اس کے پہلے گناہ بخش دیئے گئے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے گئے۔ (بخاری ومسلم، مشکوۃ، نسائی، ترغیب)

☆☆☆

پیام عید

عیدالفطر کا پیغام

مسلمانان عالم کے نام

از: مولانا حافظ شیخ کلیم اللہ عمری مدنی (استاذ ومفتی جامعہ دارالسلام عمرباد)

عید کی سچی خوشی پانے کے لئے لازم ہے کہ ہم اللہ رب العزت کے پیغام کو سامنے رکھیں، اور اس پیغام حق کے مطابق زندگی گذارنے کی پوری کوشش کریں، آج امت مسلمہ کا جو حال ہے، خواہ وہ ہند و پاک میں ہو یا عالم اسلام کے کسی بھی کونے میں اس کا حقیقی سبب خدا فراموشی ہے، (اللہ کی نافرمانی اور بغاوت) اسی کے نتیجہ میں خود فراموشی، انسانیت سوزی، ماہ رمضان میں ہنگامے اور فسادات وغیرہ کی صورتیں سامنے آرہی ہیں، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ پروردگار عالم: اسلام اور اہل اسلام کی حفاظت فرما، مساجد و مدارس جو دین مبین کے قلعے ہیں، ان کی حفاظت غیب سے فرما، دنیا میں امن وسکون برپا کردے، شر پسندوں کی شر پسندی کو خود انہی کے لئے عبرتناک بنادے، معصوموں کی جان و مال کی حفاظت فرما، **اللھم انا نجعلک فی نحورھم ونعوذبک من شرورھم، آمین یارب العالمین**

۱۔ اللہ تعالی کا پیغام اہل اسلام کے نام

ذیل میں پیام الٰہی پیش خدمت ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے

۱. قال اللہ تعالی: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا، هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (یونس)

کہہ دو کہ (یہ کتاب الٰہی) اللہ کے فضل اور اُس کی مہربانی سے (نازل ہوئی ہے) تو چاہئیے کہ لوگ اس سے خوش ہوں، یہ اُس سے کہیں بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ یعنی کتاب اللہ کا نزول درحقیقت انسانوں کے حق میں فضل الٰہی ہے، چاہیئے کہ اہل ایمان اسے دستور حیات بنالیں، اور تادم حیات اسی کے نقش قدم پر چلیں، اس کتاب کو اپنے سینوں سے لگا کر، اپنے لئے زاد سفر بنالیں۔

۲۔ قال اللہ تعالی: وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنہوں نے اللہ (کے احکام) کو بھلایا تو اللہ نے انہیں اپنی جانوں سے غافل کردیا'' (الحشر ۱۹)

یعنی عید کا پیغام انسانیت کے نام پر یہ ہے کہ خود فراموشی، خدا فراموشی کا نتیجہ ہے اس کا علاج صرف خدا شناسی اور خدا طلبی ہے، انکار کے بجائے اقرار وایمان، بغاوت کے بجائے صلح، سرکشی کے بجائے اطاعت وفرمانبرداری، اللہ سے بھاگنے کے بجائے اللہ کی طرف بھاگنا ۳۔ ارشاد ربانی ہے فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ''پس تم اللہ کی طرف

دوڑ لگاؤ (یعنی رجوع کرو) (الذاریات: ۵۰)

یعنی اللہ کی طرف رجوع ہونے کے لئے ہم سب تیار ہو جائیں ، کتاب وسنت کی پیروی کو لازم کرلیں ، اسلام کو پوری زندگی میں نافذ کرلیں ، ہمارا ہر کام اسلامی ہو، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، طرز زندگی ، معاشرت ومعاملات ، عبادات وسیاست ، الغرض ہر کام اسلامی ہو ان شاء اللہ دین ودنیا کی سعادتیں ہمیں نصیب ہوں گی، ان شاء اللہ

۲۔ عیدالفطر کا پیغام مسلمانان عالم کے نام

۱۔عید سعید اس خوش نصیب کے لئے ہے جو اللہ تعالی کی فرمانبرداری کرے اور اس کی نافرمانیوں سے بچے۔ نیز عید اس کے لئے ہے جو نماز اور روزہ کا پابند رہا ذکر الٰہی کے ساتھ شب بیداری میں مشغول رہا اور آئندہ بھی اسی طرح پابند شریعت رہنے کا عزم مصمم بھی رکھتا ہو۔

۲۔عقلمند اور ہوشیار وہ شخص ہے جو اپنے رب کی خوشنودی کی تلاش میں رہتا ہے مزید اطاعت کے دروازوں کی تلاش میں سرگردان رہتا ہے شوال کے ۶/ روزوں پیر اور جمعرات نیز ایام بیض یعنی ہر قمری ماہ میں ۱۳ ۱۴ ۱۵ تاریخ کے مسنون روزوں کے لئے کمر کس لیتا ہے۔ اور نادان اپنے لہو ولعب کے ساتھ مگن رہتا ہے یہاں تک عید کے دن فسق وفجور کے نت نئے دروازے کھولتے ہوئے شیطان کو خوش کر دیتا ہے اور نیکیاں ضائع کر لیتا ہے بنائی ہوئی عمارت خود اپنے ہاتھ سے گرا دیتا ہے ۔

۳۔حسن بصریؒ کا فرمان ہے ہر وہ دن جس میں اللہ تعالی کی معصیت نہ ہو وہ بھی عید کا دن ہے اور ہر وہ دن جس میں ایک مومن اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے ذکر واذکار میں مشغول ہو کر وقت گذارتا ہے وہ وقت بھی عید ہی عید ہے۔

۴۔عید اس کی نہیں جس نے نئے لباس زیب تن کر لئے بلکہ عید اس کی ہے جس کی اطاعت وفرمانبرداری میں ترقی ہی ترقی ہو۔

۵۔عید اس کی نہیں جو خوشنما لباس سے آراستہ ہو عید کی مناسبتوں سے نئی نئی سواریوں پر سوار ہو بلکہ حقیقی عید اس کی ہے جس کے سارے گناہ معاف کردئے گئے ہوں اور اسے دارلسلام (جنت) میں داخلہ کی خوشخبری ملنے والی ہو۔

۶۔عید اس کی نہیں ہے جو دنیا طلبی میں مال ومتاع درہم ودینار کے چکر میں حلال وحرام کی تمیز کو بالائے طاق رکھا ہو بلکہ حقیقی عید تو اس کی ہے جو اپنی آخرت سنوارنے کی فکر میں دنیا سے کفاف پر راضی ہوتا ہو اور دنیاداروں سے مرعوب ہوئے بغیر جنت میں محلات تعمیر کرتا چلا جاتا ہو ۔

۷۔عید کی حقیقی خوشیاں ان خوش نصیبوں کے لئے ہیں جو اپنے ضرورت مند بھائیوں کی ضرورتوں کی تکمیل کی کوشش کرتے ہیں اور انہی اپنی خوشیوں میں شریک کرتے ہیں، اس لئے سچ فرمایا ہے رسول اکرم ﷺ نے: وہ شخص مومن نہیں ہوسکتا جو پیٹ بھر کے کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے ۔(**الادب المفرد للبخاری ۱۱۲ ، الطبرانی والحاکم**)

۸۔بعض علماء کرام نے امت کو عید کے دن خوشیوں، کھانے پینے، لباس وپوشاک میں مشغول دیکھا تو کہنے لگے کہ اگر اللہ تعالی نے انہیں باخبر کر دیا ہے کہ ان کے اعمال صالحہ سارے کے سارے مقبول ہو چکے ہیں تو ان پر فرض یہ تھا کہ وہ شکر ادا کرنے میں مشغول رہتے ولو بالفرض ان کا عمل مقبول نہ

ہوتا تو ان پر یہ واجب ہوجاتا کہ کثرت عمل پر توجہ دیتے، نیز اخلاص کے ساتھ عمل کرنا شروع کردیتے۔

۹۔ وہی عمل عنداللہ مقبول ہے جو ریاکاری سے خالی ہو اور دائمی طور پر کیا جائے اگرچہ کہ وہ عمل عمل قلیل ہی کیوں نہ ہو۔

۱۰۔ عمل کی قبولیت کی دلیل یہ بھی ہے کہ حسن عمل میں مداومت ہو اور عملی اعتبار سے اپنی زندگی میں کچھ نہ کچھ بہتر تبدیلی ظاہر ہو۔

۱۱۔ مسلمانوں کی اجتماعیت کے اہم مظاہر حج، عیدین، پنج وقتہ نمازیں، جمعہ اور جہاد جیسی عبادتیں ہیں، جن کے لیے اجتماعیت ضروری ہے اور اجتماعیت کے بغیر مذکورہ عبادات پوری نہیں ہوں گی، اسی طرح عیدین بھی ایک اجتماعی عبادت ہے۔

۱۲۔ روزہ اور عید غالب اکثریت کے ساتھ ہی معتبر ہے۔ عیدین اجتماعیت کا سبق دیتی ہیں اسلامی عبادت میں اجتماعیت کا تصور موجود ہے۔ تنہا ایک آدمی چاند دیکھ کر عید اپنے طور پر نہیں منا سکتا بلکہ اسے عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کی نمازوں کی ادائیگی کے لیے لوگوں کی غالب اکثریت کی موافقت ضروری ہے دو چار افراد کا جماعت سے الگ ہوکر روزہ شروع کردینا یا عید منانا نہ روزہ ہے اور نہ ہی وہ عید ہے۔ اسی لیے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے حدیث مذکور کے بارے میں فرمایا" صَوْمُكُمْ يَوْمَ تَصُومُونَ وَفِطْرُكُمْ يَوْمَ يُفْطِرُونَ۔۔۔۔ (ابوداؤد) فَسَّرَ بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ هَذَا الْحَدِيثَ۔ فقال "إِنَّمَا مَعْنىٰ هَذَا الصَّوْمِ وَ الْفِطْرِ مَعَ الْجَمَاعَةِ وَ عِظَمِ النَّاسِ"۔ (فتاویٰ ۲۵/ ۱۱۵)۔ یعنی روزہ اور عید جماعت اور لوگوں کی اکثریت کے ساتھ ہی معتبر ہے۔

۱۳۔ امت محمدیہ تمام فقہی، گروہی اور مسلکی اختلافات سے بالاتر ہوکر عقیدہ کی بنیاد (**لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ**) پر متحد ہو۔ اخوت ایمانی کو مضبوط سے مضبوط تر بنائیں، ایمان کا رشتہ سب سے مضبوط اور محکم رشتہ ہے اس کی حفاظت ہم پر واجب ہے ۔ اتباع سنت کے ساتھ ساتھ شرکیہ امور سے کلی طور پر اجتناب کریں، اس سے امت کی وحدت کو تقویت پہنچے گی نہ کہ صرف ایک ہی دن میں سارے عالم میں عید منانے سے وحدت قائم ہوگی۔

۱۴۔ عید مسلمانوں کے لئے ایک عبادت اور شکر کا طریقہ ہے جو صرف رؤیت بصریہ پر ہی منحصر ہے۔ اور یہ عیدیں کرسمس اور دیپاولی کی طرح کوئی میلا یا تہوار نہیں ہے کہ وقت سے پہلے ہی تقویم کے ذریعہ اس کا اعلان کردیا جائے اور نہ یہ ممکن ہے کہ شمسی تاریخوں کی طرح قمری شرعی تقویم (کیلنڈر) کی بنیاد پر سب مسلمانوں کا عمل ہو۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ رؤیت ہی کی بنیاد پر کوئی مہینہ 29 کا ہوگا اور کوئی مہینہ 30 کا ہوگا۔ اور یہ کس مہینہ میں 29 اور کس مہینے میں 30 کا ہوگا اس کی تحدید نہیں کی جاسکتی۔

۱۵۔ رؤیت ہلال میں عالمی وحدت کا تصور ونظریہ کتاب اللہ، رسول اکرم ﷺ کی صحیح احادیث، علماء محققین حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ اور علم ہیئت جدیدہ اور جغرافیہ جدیدہ کے خلاف ہے۔

جب عالم اسلام میں نمازوں کے اوقات میں فرق وتفاوت کو وحدت کے منافی نہیں سمجھا جاتا ہے تو رؤیت ہلال کے حساب سے الگ الگ دن عیدیں اور رمضان کے آغاز کو عالم اسلام کی وحدت کے منافی کیوں سمجھا جارہا ہے۔ اور یہ نظریہ سرے سے غلط ہے کہ سعودی عرب کے ساتھ دیگر اسلامی

اور غیر اسلامی ممالک روزہ رکھیں اور عید منائیں۔ رؤیت ہلال کا مسئلہ قدرت کی جانب سے مقرر کردہ نظام ہے اس میں انسان بے بس ہے اور وہ شریعت کا پابند ہے بلکہ ہمیں چاہئے کہ فکر ونظر کو شریعت کے تابع بنائیں نہ کہ اپنے بنائے ہوئے افکار ونظریات کی تصحیح کے لئے شریعت سے دلائل جمع کرنے کی کوشش کریں اور ہمیشہ عقل کو نقل (کتاب وسنت) کے تابع رکھیں ورنہ عقل انسانی کے بے لگام ہونے کی صورت میں ہمارے گمراہ ہونے کا شدید اندیشہ ہے۔ **واللہ المستعان.**

۱۶۔عید کا پیغام یہ بھی ہے کہ کسی بھی صورت میں ہماری اجتماعیت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے اور صفوں میں اتحاد ضروری ہے جس طرح نمازوں میں صفوں کی درستگی سے نماز درست ہوتی ہے اسی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں ہمارا اتحاد قابل ذکر ہوتب ہی ہم دنیا میں سرخ رو ہوں گے۔ جس طرح صفوں کے مابین رنگ ونسل ملک وطن کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اسی طرح ہم مسلمان زندگی کے ہر شعبہ میں مل جل کر اتفاق واتحاد کے نمونے پیش کریں۔ پھر اس کے فوائد سے مالا مال ہوں گے ان شاء اللہ۔

۱۷۔عالم اسلام کے لئے عید کا پیغام یہ ہے کہ کلمہ کی بنیاد پر متحد رہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے لئے رفیق بنیں نہ کہ فریق بن جائیں آج کا حال یہ ہے کہ دشمن ہمیں فریق بنا کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ چھیڑنا چاہتا ہے اور ہماری مادی طاقتوں کو ختم کرنا چاہتا ہے اور ہماری صفوں میں دراڑیں قائم کرنا چاہتا ہے ، دیکھتے ہی دیکھتے مسلم ممالک پر اغیار کا قبضہ ہوتا جارہا ہے۔ خدارا اے مسلم ممالک : ہوش میں تو آؤ، اور جاگ جاؤ، خواب غفلت سے بیدار ہوجاؤ، ہماری سلامتی اتحاد واتفاق میں ہے، دوسروں کی مصیبت کے وقت ان کا تعاون کرنا ہمارا ایمانی تقاضہ ہے، دیکھتے ہی دیکھتے کئی مسلم ممالک تباہ ہوگئے اور کئی ممالک تباہی کے دہانے پر ہیں اللہ ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین

۱۸۔امت کی ترقی اور کامیابی کے لئے مسلکی، گروہی، رنگ ونسل، لسانی اور علاقائی عصبیتوں سے اوپر اٹھنا لازم ہے، ہم دین مبین کے داعی اور مبلغ ہیں نہ کہ مسلکوں کے داعی ہیں، ہمارا مذہب اسلام ہے، کتاب ہدایت قرآن حکیم ہے، اس کی تشریح وتفسیر سنت نبوی ﷺ ہے، صحابہ کرامؓ اس دین کو صحیح سمجھنے والے اور اس پر عمل کرنے والے تھے، ان کے فہم کو اپنی سوچ اور فکر پر ترجیح دینا ہوگا، محدثین عظام، مفسرین کرام، ائمہ ہدی، ائمہ اسلام کی قدر دانی ہو، ان کی دیانت داری پر ان کے حق میں صمیم قلب کے ساتھ دست بدعا ہوں، اس لئے کہ یہ سب دین کے سچے خادم اور مخلص داعی تھے، جزاہم اللہ احسن الجزاء۔

اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں عیدین کی صحیح اور سچی خوشی نصیب ہو اور عمل صالح زندگی بھر کرنیکی کی توفیق ملے اور خاتمہ بالخیر ہو، نیز رمضان مبارک کی ساری نیکیاں قبول ہوں، جہنم سے آزادی کا پروانہ سیدھے ہاتھ میں ملے، اور جنت الفردوس کے وارثوں میں شامل ہونے کا اعزاز ملے، روز قیامت منادی کا اعلان ہو کہ سن لو، امت محمدیہ کامیابی سے ہمکنار ہوگئی، جنت میں داخلہ کی خوشخبری مبارک ہو۔ آمین یارب العالمین

☆☆☆

زکوۃ

زکوٰۃ کیسے ادا کریں

مفتی محمد تقی عثمانی (پاکستان)

اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا ایک نصاب مقرر کیا ہے کہ اس نصاب سے کم اگر کوئی شخص مالک ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔ اگر اس نصاب کا مالک ہوگا تو زکوٰۃ فرض ہوگی۔ وہ نصاب یہ ہے: ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کی قیمت کا نقد روپیہ یا زیور، یا سامان تجارت وغیرہ، جس شخص کے پاس یہ مال اتنی مقدار میں ہو تو اس کو ''صاحب نصاب'' کہا جاتا ہے۔ پھر اس نصاب پر ایک سال گزرنا چاہئے، یعنی ایک سال تک کوئی شخص صاحب نصاب رہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اس بارے میں اکثر غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ہر روپے پر مستقل پورا سال گزرے، تب اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ یہ بات درست نہیں۔ بلکہ جب ایک مرتبہ سال کے شروع میں ایک شخص صاحب نصاب بن جائے۔

تاریخ زکوٰۃ میں جو رقم ہو اس پر زکوٰۃ ہے:۔ مثلاً فرض کریں کہ ایک شخص کے پاس یکم رمضان کو ایک لاکھ روپیہ تھا اگلے سال یکم رمضان سے دو دن پہلے پچاس ہزار روپے اس کے پاس اور آ گئے اور اس کے نتیجے میں یکم رمضان کو اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے ہو گئے، اب اس ڈیڑھ لاکھ روپے پر زکوٰۃ فرض ہوگئی، یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں پچاس ہزار روپے تو صرف دو دن پہلے آئے ہیں اور اس پر ایک سال نہیں گزرا، لہذا اس پر زکوٰۃ نہ ہونی چاہئے، یہ درست نہیں - بلکہ زکوٰۃ نکالنے کی جو تاریخ ہے اور جس تاریخ کو آپ صاحب نصاب بنے ہیں اس تاریخ میں جتنا آپ کے پاس موجود ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے، چاہے یہ رقم پچھلے سال یکم رمضان کی رقم سے زیادہ ہو یا کم ہو مثلاً ایک لاکھ روپے تھے، اب ڈیڑھ لاکھ ہیں تو ڈیڑھ لاکھ پر زکوٰۃ ادا کرو، اور اگر اس سال پچاس ہزار روپے رہ گئے، تو اب پچاس ہزار پر زکوٰۃ ادا کرو، درمیان سال میں جو رقم خرچ ہوگئی، اس کا کوئی حساب کتاب نہیں اور اس خرچ شدہ رقم پر زکوٰۃ نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حساب کی الجھن سے بچانے کے لئے یہ آسان طریقہ مقرر فرمایا ہے کہ درمیان سال میں جو کچھ تم نے کھایا پیا اور وہ رقم تمہارے پاس سے چلی گئی تو اس کا کوئی حساب کتاب کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح درمیان سال میں جو رقم آ گئی اس کا الگ سے حساب رکھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کس تاریخ میں آئی اور کب اس پر سال پورا ہوگا؟ بلکہ زکوٰۃ نکالنے کی تاریخ میں جو رقم تمہارے پاس ہے، اس پر زکوٰۃ ادا کرو۔ سال گزرنے کا یہ مطلب ہے۔

اموال زکوٰۃ کون کون سے ہیں:۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہم پر فضل ہے کہ اس نے ہر ہر چیز پر زکوٰۃ فرض نہیں فرمائی، ورنہ مال کی تو بہت ساری قسمیں ہیں۔جن چیزوں پر زکوٰۃ فرض ہے وہ یہ ہیں(۱) نقد روپیہ، چاہے وہ کسی بھی شکل میں ہو، چاہے وہ نوٹ ہوں یا سکّے ہوں۔(۲) سونا چاندی، چاہے وہ زیور کی شکل میں ہو۔بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ رہتا ہے کہ خواتین کا استعمالی زیور ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ یہ بات درست نہیں۔صحیح بات یہ ہے کہ استعمالی زیور پر بھی زکوٰۃ واجب ہے،البتہ صرف سونے چاندی کے زیور پر زکوٰۃ واجب ہے،لیکن اگر سونے چاندی کے علاوہ اور دھات کا زیور ہے، چاہے پلاٹینم ہی کیوں نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں اسیطرح ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ نہیں جب تک تجارت کے لئے نہ ہوں بلکہ ذاتی استعمال کے لئے ہوں۔

سامان تجارت کی قیمت کا طریقہ:۔ دوسری چیز جس پر زکوٰۃ فرض ہے ''سامان تجارت'' ہے مثلاً کسی کی دکان میں جو سامان برائے فروخت رکھا ہوا ہے،اس سارے اسٹاک پر زکوٰۃ واجب ہے، البتہ اسٹاک کی قیمت لگاتے ہوئے اس بات کی گنجائش ہے کہ آدمی زکوٰۃ نکالتے وقت یہ حساب لگائے کہ اگر میں پورا اسٹاک اکھٹا فروخت کروں تو بازار میں اس کی قیمت کیا لگے گی ۔ دیکھئے ایک ''ریٹیل پرائس'' ہوتی ہے اور دوسری ''ہول سیل پرائس'' تیسری صورت یہ ہے کہ پورا اسٹاک اکھٹا فروخت کرنے کی صورت میں کیا قیمت لگے گی، لہذا دکان کے اندر جو مال ہے اس کی زکوٰۃ کا حساب لگایا جارہا ہو تو اس کی گنجائش ہے کہ تیسری قسم کی قیمت لگائی جائے۔ وہ قیمت نکال کر پھر اس کا ڈھائی فیصد زکوٰۃ میں نکالنا ہوگا،البتہ احتیاط اس میں ہے کہ عام ''ہول سیل قیمت'' سے حساب لگا کر اس پر زکوٰۃ ادا کردی جائے۔

مال تجارت میں کیا کیا داخل ہے:۔ اس کے علاوہ مال تجارت میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کو آدمی بیچنے کی غرض سے خریدا ہو، لہذا اگر کسی شخص نے بیچنے کی غرض سے کوئی پلاٹ خریدا یا زمین خریدی یا کوئی مکان خریدا یا گاڑی اس مقصد سے خریدی کہ اس کو بیچکر نفع کماؤں گا تو یہ سب چیزیں مال تجارت میں داخل ہیں، لہذا اگر کوئی پلاٹ، کوئی زمین کوئی مکان خریدتے وقت شروع ہی میں یہ نیت تھی کہ اس کو فروخت کروں گا تو اسکی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جو ''انویسٹمنٹ'' کی غرض سے پلاٹ خرید لیتے ہیں اور شروع ہی سے یہ نیت ہوتی ہے کہ جب اس پر اچھے پیسے ملیں گے تو اس کو فروخت کردوں گا اور فروخت کر کے اس سے نفع کماؤں گا، تو اس پلاٹ کی مالیت پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔لیکن اگر پلاٹ اس نیت سے خریدا کہ اگر موقع ہوا تو اس پر رہائش کے لئے مکان بنالیں گے، یا موقع ہوگا تو اس کو کرائے پر چڑھا دیں گے یا کبھی موقع ہوگا تو اس کو فروخت کریں گے، کوئی ایک واضح نیت نہیں ہے بلکہ ویسے ہی خرید کر ڈال دیا ہے، اب اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آئندہ کسی وقت اس کو مکان بنا کر وہاں رہائش اختیار کرلیں گے اور یہ بھی احتمال ہے کہ کرائے پر چڑھا دیں گے اور یہ بھی ہے کہ فروخت کردیں گے تو اس صورت میں اس پلاٹ پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ لہذا زکوٰۃ صرف اس صورت میں واجب ہوتی ہے جب خریدتے وقت ہی اس کو دوبارہ

فروخت کرنے کی نیت ہو، یہاں تک کہ اگر پلاٹ خریدتے وقت شروع میں یہ نیت تھی کہ اس پر مکان بنا کر رہائش اختیار کریں گے، بعد میں ارادہ بدل گیا اور یوں ارادہ کرلیا کہ اب اس کو فروخت کرکے پیسے حاصل کرلیں گے تو محض نیت اور ارادہ کی تبدیلی سے فرق نہیں پڑتا جب تک آپ اس پلاٹ کو واقعۃً فروخت نہیں کردیں گے اور اس کے پیسے نہیں آ جائینگے اس وقت تک اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بہرحال، ہر وہ چیز جسے خریدتے وقت ہی اس کو فروخت کرنے کی نیت ہو، وہ مال تجارت ہے۔اور اس کی مالیت پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہے، یہ بات بھی یادرکھیں کہ مالیت اس دن کی معتبر ہوگی جس دن آپ زکوٰۃ کا حساب کررہے ہیں مثلاً ایک پلاٹ آپنے ایک لاکھ روپے میں خریدا تھا اور آج اس پلاٹ کی قیمت دس لاکھ ہوگئی، اب دس لاکھ پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائیگی، ایک لاکھ پر نہیں نکالی جائیگی۔

کمپنیوں کے شیئرز پر زکوٰۃ کا حکم:۔اسی طرح کمپنیوں کے ''شیئرز'' بھی سامان تجارت میں داخل ہیں۔ اور انکی دو صورتیں ہیں ایک صورت یہ ہے کہ آپ نے کسی کمپنی کے شیئرز اس مقصد کے لئے خریدے ہیں کہ اس کے ذریعہ کمپنی کا منافع (dividend) حاصل کریں گے اور اس پر ہمیں سالانہ منافع کمپنی کی طرف سے ملتا رہے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ نے کسی کمپنی کے شیئرز ''کیپٹیل گین'' کے لئے خریدے ہیں۔یعنی نیت یہ ہے کہ جب بازار میں ان کی قیمت بڑھ جائے گی تو ان کی فروخت کرکے نفع کمائیں گے۔اگر یہ دوسری صورت ہے یعنی شیئرز خریدتے وقت شروع ہی میں ان کو فروخت کرنے کی نیت تھی تو اس صورت میں پورے شیئرز کی بازاری پوری قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی مثلاً آپ نے پچاس روپے کے حساب سے شیئرز خریدے اور مقصد یہ تھا کہ جب ان کی قیمت بڑھ جائے گی تو ان کو فروخت کرکے نفع حاصل کریں گے، اس کے بعد جس دن آپ نے زکوٰۃ کا حساب نکالا، اس دن شیئرز کی قیمت ساٹھ روپے ہوگئی تو اب ساٹھ روپے کے حساب سے ان شیئرز کی مالیت نکالی جائے گی اور اس پر ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

لیکن اگر پہلی صورت ہے یعنی آپ نے کمپنی کے شیئرز اس نیت سے خریدے کہ کمپنی کی طرف سے سالانہ منافع ملتا رہیگا اور اور فروخت کرنے کی نیت نہیں تھی تو اس صورت میں آپ کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ یہ دیکھیں کہ جس کمپنی کے یہ شیئرز ہیں اس کمپنی کے کتنے اثاثے جامد ہیں مثلاً بلڈنگ، مشینری، کاریں وغیرہ اور کتنے اثاثے نقد، سامان تجارت اور خام مال کی شکل میں ہیں، یہ معلومات کمپنی ہی سے حاصل کی جا سکتی ہیں، مثلاً فرض کریں کہ کمپنی کے ساٹھ فیصد اثاثے نقد سامان تجارت، خام مال اور تیار مال کی صورت میں ہیں اور چالیس فیصد اثاثے بلڈنگ مشینری اور کار وغیرہ کی صورت میں ہیں تو اس صورت میں آپ ان شیئرز کی بازاری قیمت لگا کر اس کی ساٹھ فیصد قیمت پر زکوٰۃ ادا کریں، مثلاً شیئرز کی بازاری قیمت ساٹھ روپئے تھی اور کمپنی کے ساٹھ فیصد اثاثے قابل زکوٰۃ تھے اور چالیس فیصد اثاثے نا نا قابل زکوٰۃ ہیں تو اس صورت میں آپ اس شیئرز کی پوری قیمت یعنی ساٹھ روپے

کے بجائے =/۳۶ روپے پر زکوٰۃ ادا کریں۔اور اگر کمپنی کے اثاثوں کی تفصیل معلوم نہ ہو سکے تو اس صورت میں احتیاطاً ان شیئرز کی پوری بازاری قیمت پر زکوٰۃ ادا کردی جائے، شیئرز کے علاوہ اور جتنے فائینانشل انسٹرومنٹس ہیں۔ چاہے وہ بونڈز ہوں یا سرٹیفکٹس ہوں، یہ سب نقد کے حکم میں ہیں، ان کی اصل قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے۔

کارخانہ کی کن اشیاء پر زکوٰۃ ہے:۔ اگر کوئی شخص فیکٹری کا مالک ہے تو اس کی فیکٹری میں جو تیار شدہ مال ہے اس کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے، اسی طرح تیاری کے مختلف مراحل میں ہے یا خام مال کی شکل میں ہے اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے، البتہ فیکٹری کی مشینری، بلڈنگ، گاڑیوں وغیرہ پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

اس طرح اگر کسی شخص نے کاروبار میں شرکت کے لئے روپیہ لگایا ہوا ہے، اور اس کاروبار کا کوئی متناسب حصّہ اس کی ملکیت ہے تو جتنا حصّہ اس کی ملکیت ہے اس حصّے کی بازاری قیمت کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بہرحال خلاصہ یہ ہے کہ نقد روپیہ جس میں بینک بیلنس اور فائینانشل انسٹرومنٹس بھی داخل ہیں، ان پر زکوٰۃ واجب ہے، اور سامان تجارت جس میں تیار مال، خام مال، اور جو مال تیاری کے مراحل میں ہیں وہ سب سامان تجارت میں داخل ہیں، اور کمپنی کے شیئرز بھی سامان تجارت میں داخل ہیں، اسکے علاوہ ہر چیز جو آدمی نے فروخت کرنے کی غرض سے خریدی ہو وہ بھی سامان تجارت میں داخل ہے، زکوٰۃ نکالتے وقت ان سب کی مجموعی مالیت نکالیں اور اس پر زکوٰۃ ادا کریں۔

واجب الوصول قرضوں پر زکوٰۃ:۔ ان کے علاوہ بہت سی رقمیں وہ ہوتی ہیں جو دوسروں سے واجب الوصول ہوتی ہیں۔ مثلاً دوسروں کو قرض دے رکھا ہے، یا مثلاً مال ادھار فروخت کر رکھا ہے اس کی قیمت ابھی وصول ہونی ہے، تو جب آپ زکوٰۃ کا حساب لگائیں، اور اپنی مجموعی مالیت نکالیں تو بہتر یہ ہے کہ ان قرضوں کو اور واجب الوصول رقموں کو آپ اپنی مجموعی مالیت میں شامل کر لیں۔ اگر چہ شرعی حکم یہ ہے کہ جو قرضے ابھی وصول نہیں ہوئے تو جب تک وہ وصول نہ ہو جائیں اس وقت تک شرعاً ان پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں ہوتی، لیکن جب وصول ہو جائیں تو جتنے سال گزر چکے ہیں ان تمام پچھلے سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ مثلاً فرض کریں کہ آپ نے ایک شخص کو ایک لاکھ روپیہ قرضہ دے رکھا تھا۔ اور پانچ سال کے بعد وہ قرضہ آپ کو واپس ملا، تو اگر چہ اس ایک لاکھ روپے پر ان پانچ سالوں کے دوران تو زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں تھی، لیکن جب وہ ایک لاکھ روپے وصول ہو گئے تو اب گذشتہ پانچ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔ تو چونکہ گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ یکمشت ادا کرنے میں بعض اوقات دشواری ہوتی ہے۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ ہر سال اس قرض کی زکوٰۃ کی ادائیگی بھی کردی جایا کرے۔ لہذا جب زکوٰۃ کا حساب لگائیں تو ان قرضوں کو بھی مجموعی مالیت میں شامل کرلیا کریں۔

قرضوں کی منہائی:۔ پھر دوسری طرف یہ دیکھیں کہ آپ کے ذمے دوسرے لوگوں کے کتنے قرضے ہیں۔ اور پھر مجموعی مالیت میں سے ان قرضوں کو منہا کردیں، منہا کرنے کے بعد جو باقی بچے وہ قابل زکوٰۃ رقم ہے۔ اس کا پھر ڈھائی فیصد نکال کر زکوٰۃ کی نیت سے ادا کردیں۔ بہتر یہ ہے کہ جو رقم زکوٰۃ

کی بنے اتنی رقم الگ نکال کر محفوظ کرلیں۔ پھر وقتاً فوقتاً اس کو مستحقین میں خرچ کرتے رہیں۔ بہرحال زکوٰۃ کا حساب لگانے کا یہ طریقہ ہے۔

قرضوں کی دو قسمیں ہیں:۔قرضوں کے سلسلے میں ایک بات اور سمجھ لینی چاہیے، وہ یہ کہ قرضوں کی دو قسمیں ہیں ایک تو معمولی قرض ہیں جنکو انسان اپنی ذاتی ضروریات اور ہنگامی ضروریات کیلئے مجبوراً لیتا ہے۔

دوسری قسم کے قرضے وہ ہیں جو بڑے بڑے سرمایہ دار پیداواری اغراض کے لئے لیتے ہیں۔مثلاً فیکٹریاں لگانے، یا مشینریاں خریدنے یا مال تجارت امپورٹ کرنے کے لئے قرضے لیتے ہیں۔ یا مثلاً ایک سرمایہ دار کے پاس پہلے سے دو فیکٹریاں موجود ہیں ۔لیکن اس نے بینک سے قرض لے کر تیسری فیکٹری لگالی۔اب اگر اس دوسری قسم کے قرضوں کو مجموعی مالیت سے منہا کیا جائے، تو نہ صرف یہ کہ ان سرمایہ داروں پر ایک پیسے کی بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ وہ لوگ الٹے مستحق زکوٰۃ بن جائیں گے،اس لئے کہ ان کے پاس جتنی مالیت کا مال موجود ہے، اس سے زیادہ مالیت کے قرضے بینک سے لے رکھے ہیں، وہ بظاہر فقیر اور مسکین نظر آرہا ہے۔لہذا ان قرضوں کے منہا کرنے میں بھی شریعت نے فرق رکھا ہے۔

تجارتی قرضے کب منہا کئے جائیں:۔اس میں تفصیل یہ ہے کہ پہلی قسم کے قرضے تو مجموعی مالیت سے منہا ہوجائیں گے۔ اور ان کو منہا کرنے کے بعد زکوٰۃ ادا کی جائیگی۔اور دوسری قسم کے قرضوں میں یوں تفصیل ہے کہ اگر کسی شخص نے تجارت کی غرض سے قرض لیا۔اور اس قرض کو ایسی اشیاء خریدنے میں استعمال کیا جو قابل زکوٰۃ ہیں مثلاً اس قرض سے خام مال خریدلیا، یا مال تجارت خریدلیا، تو اس قرض کو مجموعی مالیت سے منہا کریں گے۔لیکن اگر اس قرض کو ایسے اثاثے خریدنے میں استعمال کیا جو نا قابل زکوٰۃ ہیں تو اس قرض کو مجموعی مالیت سے منہا نہیں کریں گے،مثلاً ایک شخص نے بینک سے ایک کروڑ روپے قرض لئے اور اس رقم سے اس نے ایک پلانٹ (مشینری) باہر سے امپورٹ کرلیا۔چونکہ یہ پلانٹ قابل زکوٰۃ نہیں ہے اس لئے کہ یہ مشینری ہے تو اس صورت میں یہ قرضہ منہا نہیں ہوگا۔لیکن اگر اس نے اس قرض سے خام مال خریدلیا تو چونکہ خام مال قابل زکوٰۃ ہے اس لئے یہ قرض منہا کیا جائے گا کیونکہ دوسری طرف یہ خام مال ادا کی جانے والی زکوٰۃ کی مجموعی مالیت میں پہلے سے شامل ہوچکا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نارمل قسم کے قرض تو پورے مجموعی مالیت سے منہا ہوجائیں گے۔اور جو قرضے پیداواری اغراض کے لئے لیے گئے ہیں اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر اس سے نا قابل زکوٰۃ اثاثے خریدے ہیں تو وہ قرض منہا نہیں ہوگا اور اگر قابل زکوٰۃ اثاثے خریدے ہیں تو وہ قرض منہا ہوگا۔ یہ تو زکوٰۃ نکالنے کے بارے میں احکام تھے۔

زکوٰۃ مستحق کو ادا کریں:۔بعض لوگ زکوٰۃ نکالتے تو ہیں لیکن اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ صحیح مصرف پر خرچ ہورہی ہے یا نہیں؟ زکوٰۃ نکال کر کسی کے حوالے کردی اور اس کی تحقیق نہیں کی کہ یہ صحیح مصرف پر خرچ کریگا یا نہیں؟ آج بے شمار ادارے دنیا میں کام کررہے ہیں، ان میں بہت سے ادارے ایسے بھی ہوں گے جن میں بسا اوقات اس بات کا

لحاظ نہیں ہوتا ہوگا کہ زکوٰۃ کی رقم صحیح مصرف پر خرچ ہو رہی ہے یا نہیں؟ اس لئے فرمایا کہ زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی جو مستحق زکوٰۃ ہے اس کو ادا کرو۔

مستحق کون؟:۔ اس کے لئے شریعت نے یہ اصول مقرر فرمایا کہ زکوٰۃ صرف انہیں اشخاص کو دی جاسکتی ہے جو صاحب نصاب نہ ہوں۔ یہاں تک کہ اگر ان کی ملکیت میں ضرورت سے زائد ایسا سامان موجود ہے جو ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت تک پہنچ جاتا ہے تو بھی وہ مستحق زکوٰۃ نہیں رہتا۔ مستحق زکوٰۃ وہ ہے جس کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کی رقم یا اتنی مالیت کا کوئی سامان ضرورت سے زائد نہ ہو۔

مستحق کو مالک بنا کر دیں:۔ اس میں بھی شریعت کا یہ حکم ہے کہ اس مستحق زکوٰۃ کو مالک بنا کر دو یعنی وہ مستحق زکوٰۃ اپنی ملکیت میں خود مختار ہو کر جو چاہے کرے۔ اسی وجہ سے کسی بلڈنگ کی تعمیر پر زکوٰۃ نہیں لگ سکتی، کسی ادارے کے ملازمین کی تنخواہوں پر زکوٰۃ نہیں لگ سکتی۔ اس لئے کہ اگر زکوٰۃ کے ذریعہ تعمیرات کرنے اور ادارے قائم کرنے کی اجازت دے دیجاتی تو زکوٰۃ کی رقم سب لوگ کھا پی کر ختم کر جاتے، کیونکہ اداروں کے اندر تنخواہیں بے شمار ہوتی ہیں، تعمیرات پر خرچ لاکھوں کا ہوتا ہے، اس لئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ غیر صاحب نصاب کو مالک بنا کر زکوٰۃ دو، یہ زکوٰۃ فقراء اور غرباء اور کمزوروں کا حق ہے! لہذا یہ زکوٰۃ انہی تک پہنچنی چاہئے۔ جب ان کو مالک بنا کر دو گے تو تمہاری زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

کن رشتہ داروں کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے ؟:۔ یہ زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم انسان کے اندر یہ طلب اور جستجو خود بخود پیدا کرتا ہے کہ میرے پاس زکوٰۃ کے اتنے پیسے موجود ہیں، ان کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا ہے۔ اس لئے وہ مستحقین کو تلاش کرتا ہے اور ان کی فہرست بناتا ہے، پھر ان کو زکوٰۃ پہنچاتا ہے یہ بھی انسان کی ذمہ داری ہے۔ آپکے محلے میں، ملنے جلنے والوں میں، عزیز و اقارب اور رشتہ داروں میں دوست و احباب میں جو مستحق زکوٰۃ ہوں، انکو ادا کریں اور ان میں سے سب سے افضل یہ ہے کہ اپنے رشتہ داروں کو زکوٰۃ ادا کریں۔ اس میں ڈبل ثواب ہے زکوٰۃ ادا کرنے کا ثواب بھی ہے اور صلہ رحمی کا ثواب بھی ہے۔ اور تمام رشتہ داروں کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ صرف دو رشتے ایسے ہیں جنکو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی ہے، ایک ولادت کا رشتہ ہے۔ لہذا باپ بیٹے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا اور بیٹا باپ کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا، دوسرا نکاح کا رشتہ ہے لہذا شوہر بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا اور بیوی شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی۔ ان کے علاوہ باقی تمام رشتوں میں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ مثلاً بھائی کو، بہن کو، چچا کو، خالہ کو، پھوپھی کو، ماموں کو، زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ البتہ یہ ضرور دیکھ لیں کہ وہ مستحق زکوٰۃ ہوں اور صاحب نصاب نہ ہوں۔

بیوہ اور یتیم کو زکوٰۃ دینے کا حکم :۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی خاتون بیوہ ہے تو اس کو زکوٰۃ ضرور دینی چاہئے۔ حالانکہ یہاں بھی شرط ہے کہ وہ مستحق زکوٰۃ ہو اور صاحب نصاب نہ ہو۔ اگر بیوہ مستحق زکوٰۃ ہے تو اسکی مدد کرنا بڑی اچھی بات ہے لیکن اگر ایک خاتون بیوہ ہے اور مستحق زکوٰۃ نہیں ہے تو محض بیوہ ہونے کی وجہ سے وہ مصرف

زکوٰۃ نہیں بن سکتی۔اسی طرح یتیم کوزکوٰۃ دینااوراس کی مدد کرنا بہت اچھی بات ہےلیکن دیکھ کرزکوٰۃ دینی چاہیے کہ وہ مستحق زکوٰۃ ہے؟ لیکن اگرکوئی یتیم ہےمگروہ مستحق زکوٰۃ نہیں ہے بلکہ صاحب نصاب ہے تو یتیم ہونے کے باوجود اس کوزکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ان احکام کومدنظر رکھتے ہوئے زکوٰۃ نکالنی چاہیئے۔

زکوٰۃ کی تاریخ کیا ہونی چاھئے ؟:۔ ایک بات یہ سمجھ لیں کہ زکوٰۃ کے لئے شرعاً کوئی تاریخ مقررنہیں ہےاورنہ کوئی زمانہ مقرر ہے کہ اس زمانے میں یااس تاریخ میں زکوٰۃ ادا کیجائے بلکہ ہرآدمی کی زکوٰۃ کی تاریخ جداہوجاتی ہے شرعاً زکوٰۃ کی اصل تاریخ وہ ہے جس تاریخ اورجس دن آدمی پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنا،مثلاً ایک شخص یکم محرم الحرام کوپہلی مرتبہ صاحب نصاب بنا تواس کی زکوٰۃ کی تاریخ یکم محرم الحرام ہوگی اب آئندہ ہرسال اس کو یکم محرم الحرام کوزکوٰۃ کا حساب کرنا چاہیئے۔لیکن اکثرایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو یہ یادنہیں رہتا کہ ہم کس تاریخ کو پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنے تھے،اس لئے اس مجبوری کی وجہ سے وہ اپنے لئے کوئی ایسی تاریخ زکوٰۃ کے حساب کی مقررکرلے جس میں اس کے لئے حساب لگانا آسان ہو، پھرآئندہ ہرسال اسی تاریخ کوزکوٰۃ کا حساب کرکے زکوٰۃ ادا کرے،البتہ احتیاطاً کچھ زیادہ ادا کردیں۔

کیا رمضان المبارک کی تاریخ مقرر کر سکتے ھیں:۔ عام طور پرلوگ رمضان المبارک میں زکوٰۃ نکالتے ہیں،اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ رمضان المبارک میں ایک فرض کا ثواب ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔لہذا زکوٰۃ بھی چونکہ فرض ہے اگررمضان المبارک میں ادا کریں تو اس کا ثواب بھی ستّر گنا ملے گا،بات اپنی جگہ بالکل درست ہےاور یہ جذبہ بہت اچھا ہے،لیکن اگرکسی شخص کواپنے صاحب نصاب بننے کی تاریخ معلوم ہےتومحض اس ثواب کی وجہ سے وہ شخص رمضان المبارک کی تاریخ مقررنہیں کرسکتا،لہذااس کو چاہیئے کہ اسی تاریخ پراپنی زکوٰۃ کا حساب کرے۔البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی میں یہ کرسکتا ہے کہ اگرتھوڑی تھوڑی زکوٰۃ ادا کررہا ہے تو اس طرح ادا کرتا رہے اور باقی جو بچے اس کو رمضان المبارک میں ادا کردے۔البتہ اگرتاریخ یادنہیں ہےتو پھرگنجائش ہے کہ رمضان المبارک کی کوئی تاریخ مقرر کرلے،البتہ احتیاطاً زیادہ ادا کرے تاکہ اگرتاریخ کے آگے پیچھے ہونے کیوجہ سے جو فرق ہوگیا ہووہ فرق بھی پورا ہوجائے۔

پھرجب ایک مرتبہ جوتاریخ مقررکرلےتو پھرہرسال اسی تاریخ کواپنا حساب لگائے اور یہ دیکھے کہ اس تاریخ میں میرے کیا کیا اثاثے موجود ہیں،اس تاریخ میں نقدرقم کتنی ہے،اگر سونا موجود ہےتو اسی تاریخ کی سونے کی قیمت لگائے،اگر شیئرز ہیں تو اسی تاریخ کی قیمت لگائے،اگراسٹاک کی قیمت لگانی ہےتواسی تاریخ کی اسٹاک کی قیمت لگائےاور پھرہرسال اسی تاریخ کوحساب کرکے زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے،اس تاریخ سے آگے پیچھےنہیں کرنا چاہئے۔

بہرحال،زکوٰۃ کے بارے میں یہ تھوڑی سی تفصیل عرض کردی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کوان احکام پرعمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

☆☆☆

بحث وتحقیق

حدیث کے بارے میں شیعہ اور خوارج کا نقطۂ نظر

تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی

صحابہ کرام کو اس بارے میں ذرا بھی شک نہیں تھا کہ رسول پاک علیہ السلام کا ہر حکم اور آپ کی ہر بات ان کے لیے واجب الاتباع ہے، اور اس کو آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے وہ مکلّف ہیں، تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان میں آپس میں نہ ہی کوئی دشمنی تھی اور نہ ہی نفرت، عقیدہ کی وحدت، نبی وشریعت کی محبت اور اخوت کا نظریہ ان سب کو اتحاد کی ایک لڑی میں پروئے ہوئے تھا، ان کے اندر اخوت کی جڑیں کتنی مضبوط تھیں اس کا کچھ اندازہ ان آیات سے ہوسکتا ہے، محمد رسول اللہ والذین معه اشداء ..... من اثر السجود (الفتح:۲۹) اور خاص طور سے انصار کے بارے میں یہ آیت: یحبون من هاجر الیهم ..... خصاصة (الحشر:۹)

اگر ان کے درمیان کبھی کسی مسئلہ میں اختلاف بھی ہوتا تو حق کے واضح ہونے کے بعد اسے قبول کرنے میں انہیں ذرا بھی تردد نہ ہوتا تھا، اختلاف کرتے وقت بھی وہ ایک دوسرے کی عزت وآبرو کا پورا خیال رکھتے، اور ان میں سے جو بھی کسی اعتبار سے فضیلت کا مستحق ہوتا اس کا اعتراف کرتے۔

رسول اکرم کی وفات کے بعد ان کے مابین خلافت کے مسئلہ میں اختلاف ہوا، مگر تعجب ہوتا ہے کہ اس سنگین مسئلہ کو کس سنجیدگی سے انہوں نے حل کرلیا اور بغیر کوئی قطرۂ خون بہائے کیسے وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق ہوگئے۔

ان جیسے واقعات سے ہمیں صحابہ کی عظمت وبلندی اور معاشرت کی مضبوطی اور اخوت کی جہانگیری کا اندازہ ہوتا ہے، یہ صورتحال حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے پورے دور خلافت اور حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دور تک باقی رہی، باہمی خیر خواہی، اختلاف میں اعتدال، حق کا اظہار، اور اس سلسلہ میں بے باکی، دین کی بنیادوں پر باہمی تعاون اور امیر کی اطاعت ان کے امتیازی اوصاف تھے، لیکن جب خلافت عثمانی کے آخری دور میں فتنہ بھڑکا اور یہودی وعجمی بہت سے نے فرقوں نے اسلامی چہرہ کے ساتھ ظہور کیا، پھر حضرت عثمان کی شہادت کا حادثہ پیش آیا اور حضرت علی کو بھی شہید کردیا گیا تب حالات دگر گوں ہوگئے، اور اب صحابہ کرام پر زبان درازی کی جانے لگی، اور حضرت علی کی محبت کا سہارا لے کر ذاتیات صحابہ پر طعن وتشنیع کے تیر برسائے جانے لگے، جس طرح یہ سب کچھ شیعوں کی طرف سے ہونے لگا بعینہ یہی طرز عمل واقعہ تحکیم کے بعد خوارج نے بھی اپنایا، اور اس طرح جمہور صحابہ کی تکفیر کی گئی، اگر چہ امت کا جمہور طبقہ اس وقت بھی معتدل نقطۂ نظر رکھتا تھا اور تمام صحابہ کو ثقہ اور عادل گردانتا، ان میں جو اختلاف ومشاجرات ہوئے ان کو اجتہادی نظریات پر محمول کرتا اور ان کی عظمت و قربانیوں کا اعتراف کرتا۔

شیعہ اور خوارج کی طرف سے برپا کئے گئے اس فتنہ نے

یہیں پر بس نہیں کیا بلکہ اس کے نتیجہ میں صحابہ کی طرف بہت سے ایسے اقوال منسوب کر دئے گئے جو ان کی زبان سے کبھی نکلے بھی نہ تھے، افسوس یہ کہ صحابہ پر زبان درازی اور ان کے خلاف جھوٹی حدیثیں گھڑنے کا سلسلہ سب سے پہلے انہی شیعوں نے شروع کیا۔

خوارج کا نظریہ: اس اختلاف کی وجہ سے شیعہ اور خوارج کے نظریات کا عامۃ المسلمین سے مخالف ہونا بالکل منطقی بات تھی، خوارج کے تمام فرقے فتنے سے پہلے تمام صحابہ کو عادل وثقہ مانتے تھے مگر واقعہ تحکیم بعد بشمول حضرت علی و عثمان واصحاب جمل رضی اللہ عنہم تمام ان لوگوں کو بھی کافر سمجھتے جو تحکیم پر راضی ہوئے اور اسے قبول کیا، اور اس کی وجہ سے انہوں نے صحابہ کی اکثریت کو غیر ثقہ قرار دے کر ان کی روایت کردہ حدیثوں کو رد کر دیا۔

شیعہ کا نظریہ: ان کے نزدیک چونکہ خلافت کے اولین مستحق حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، اس لئے حضرت صدیق کے پر بیعت کرنے میں جو جو صحابہ بھی شامل تھے ان سب کو یہ کافر خیال کرتے، اور حضرت صدیقؓ وعمرؓ وعثمانؓ کے ساتھ ساتھ حضرت عائشہؓ اور طلحہؓ وزبیرؓ وغیرھم کی تکفیر کرتے، ان کے خیال میں صرف چند صحابہ اور بعض روایات کی رو سے صرف پندرہ صحابہ دائرہ اسلام میں باقی رہ گئے تھے، اسی وجہ سے جمہور صحابہ کی روایت کردہ احادیث کو انہوں نے بھی رد کر دیا، صرف ان روایات کو قبول کیا جو ان کے ائمہ کے واسطہ سے مروی ہوں، جن لوگوں نے سیاسی موقف میں حضرت علیؓ کی مخالفت کی ان کی حمایت کرنے والا ان کے نزدیک ثقہ ہو ہی نہیں سکتا، اگر چہ انہی میں زیدیہ نامی ایک معتدل فرقہ بھی گزرا جو تفضیل علی کے نظریہ کے باوجود شیخین کی خلافت کو صحیح سمجھتا اور ان کے فضل کا اعتراف کرتا، اس فرقہ کے فقہی نظریات بڑی حد تک اہل سنت کے موافق ہیں۔

جمہور کا نظریہ: مسلمانوں کا سواد اعظم تمام صحابہ کی عدالت وثقاہت کا قائل تھا خواہ ان میں سے کوئی تحکیم میں شامل ہی رہا ہو یا آپس میں ہونے والے مشاجرات میں کسی کا بھی طرفدار رہا ہو، جمہور کے نزدیک تمام صحابہ عادل تھے اور سب کی روایات قابل قبول تھیں، البتہ حضرت علیؓ سے بیان کردہ وہ صرف ان حدیثوں کو قبول کرتے جو ابن مسعودؓ کے شاگردوں سے مروی ہوتیں، کیوں کہ شیعوں نے حدیث میں بڑی بے دردی سے جھوٹ و دروغ گوئی کو جائز رکھا تھا، اس وجہ سے سوائے ابن مسعودؓ کے شاگردوں کے وہ قابل اعتماد نہیں تھے۔

نتیجۂ اختلاف: اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ کرام وتابعین وتبع وتابعین اور ائمہ حدیث نے احادیث کا جو ذخیرہ مدون ومرتب کیا شیعوں کی طرف سے انہیں رد کر دیا گیا، خاص طور سے جو احادیث صحابہ کے فضائل کے سلسلہ میں تھیں شیعوں نے یک لخت ان کو جھٹلا دیا، سوائے ان احادیث کے جو ان کے اماموں کی بیان کردہ روایات کے موافق ہوتیں، اسی وجہ سے جو حدیثیں جمہور کے نزدیک صحیح درجہ کی ہیں ان پر انہوں نے وضع کا حکم لگا دیا۔ مثال کے طور پر وہ حدیث جس میں یہ ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مسجد کی طرف کھلنے والے ہر دروازہ کو بند کر دینے کا حکم دیا سوائے حضرت صدیق کے دروازے (یا کھڑکی) کے، یہ حدیث جمہور کے نزدیک ہر طرح کے ضعف سے پاک ہے اور حجت کے درجہ پر پوری اترتی ہے، مگر شیعوں نے اس کو موضوع سمجھا کیوں کہ اس کے بالمقابل ان کے وہ حدیث صحیح ہے جس کے مطابق بہ خصوصی اجازت حضرت علیؓ کو حاصل ہوئی۔

اس کے برعکس خلفاء ثلاثہؓ اور ان کے ہم خیال لوگوں کے بارے میں شیعوں کے نظریہ کی بنیاد جس حدیث (غدیر خم) پر ہے وہ جمہور کے نزدیک موضوع ہے اور عقل بھی اس کی تائید کرتی ہے، کیوں کہ عقلا یہ ممکن ہی نہیں کہ جس وصیت کا آپ ﷺ نے صحابہ کے عام مجمع میں اعلانیہ اظہار کیا تھا اسے صحابہ چھپائے رکھیں، جبکہ یہ معلوم ہے کہ انہیں دین کی نشر واشاعت کی کس درجہ فکر تھی اور اس بارے میں وہ کسی مصالحت پر آمادہ ہوتے تھے اور نہ کسی سے ڈرتے، جب جمعہ کے خطبہ کے وقت بیٹھنے اور عورتوں کے مہر جیسے معاملات میں وہ خاموش نہ رہ سکے تو رسول پاک کی اس وصیت کو کیسے چھپا سکتے ہیں جس میں آپ نے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کی تعیین کی تھی، اگر صحابہ کرام ہی نعوذ باللہ ایسا کرنے لگے تو دین کا بھرم کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ اور جو شریعت ان کے واسطہ سے ہم تک پہنچی ہے ہم کیسے اس پر بھروسہ کر سکتے ہیں؟ اور کیا اس سے آپ ﷺ کی شان پر بھی حرف نہیں آتا کہ آپ کے صحابہ نعوذ باللہ دھوکے باز اور جھوٹے تھے؟

جمہور صحابہ کی بیان کردہ روایات کے بارے میں جو طرز عمل شیعوں نے اپنایا قریب قریب وہی نقطۂ نظر خوارج کا بھی رہا، البتہ چونکہ خوارج تقیہ کے قائل نہیں تھے اس وجہ سے شیعوں کی طرح انہوں نے آنحضور کی طرف جھوٹی حدیثیں منسوب نہیں کیں۔ ہاں بہت سے تشریعی احکام و عقائد میں جمہور سے انہوں نے اختلاف کیا، مثلا، پھوپھی اور بھتیجی یا خالہ اور بھانجی کو ایک نکاح میں جمع کرنے کی حلت اور رجم کا انکار جیسے مسائل میں وہ جمہور کے بالکل مخالف رہے۔

لیکن جیسا کہ بعض حضرات نے سمجھا ہے اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ دین سے جاہل تھے یا خدا اور رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھتے تھے بلکہ دراصل اس کا سبب یہ تھا کہ جو روایات فتنہ کے بعد سامنے آئیں یا جن روایات کے راوی فتنہ میں شریک رہے انہوں نے اس طرح کی تمام روایات کو رد کر دیا۔

لیکن یہ کہنا بڑا ظلم ہے کہ جو صحابہ نزاع علی ومعاویہ رضی اللہ عنہم میں شامل رہے ہم انہیں مرتبۂ ثقاہت سے گرادیں اور ان کو فاسق وکافر خیال کرنے لگیں! اس اعتبار سے خوارج کا یہ نظریہ نتیجہ اور قباحت کے اعتبار سے شیعوں کے نظریہ سے ذرا بھی کم نہیں۔ کیوں کہ روایت پر اعتماد کرنے نہ کرنے کا دارومدار صحابی کی نیت وراست بازی پر ہے، اس میں ان کی سیاسی آراء کا کوئی دخل نہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام صحابہ صدق وراست بازی میں انتہائی اعلی درجہ پر تھے تو محض ان کے سیاسی موقف کی وجہ سے ان کی روایات کو رد کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

کیا یہ بالکل ایسا نہیں کہ ایک شخص جس نے ملکی خدمات میں نمایاں کردار ادا کیا اور اپنے قلم، اپنے مال اور اپنی جان سے سامراجیت کا مقابلہ کیا اسے محض اس وجہ سے ملکی لیڈروں اور ہیروز کے زمرہ سے خارج کر دیا جائے کہ بعد میں اس نے سیاسی اختلاف کی وجہ سے ملک کے کسی دوسرے لیڈر سے جنگ کی تھی، جس طرح حق وانصاف کی ترازو میں یہ ناجائز ہے اسی طرح خوارج وشیعہ کے وہ نظریات بھی ظلم پر مبنی ہیں جن کی رو سے ان صحابہ کی تکذیب کی جاتی ہے جو نزاع علی ومعاویہ میں شامل رہے اور حضرت علی کے سیاسی موقف کی موافقت نہیں کی۔

خلاصۂ کلام: یہ کہ خوارج وشیعہ کی طرف سے حدیث پر بڑا ظلم کیا گیا، صحابہ کے بارے میں ان کی غیر منصفانہ آراء کا فقہی اختلافات بھی بڑا اثر پڑا اور اسی وجہ سے حدیث کے خلاف شبہات واعتراضات برپا کیے گئے۔

(السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی)

☆☆☆

فقہی مباحث

بیع وفا (بیع بشرط واپسی) کا شرعی حکم

محمد قمر الزماں ندوی

تمہید:

خرید وفروخت کی دنیا میں بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ جتنا روپیہ قرض لینا ہوتا ہے، مقروض اپنا مکان، دکان (یا کوئی اور سامان) قرض دینے والے کے ہاتھ اس شرط کیساتھ فروخت کر دیتا ہے کہ وہ جب قرض ادا کردے گا تو اپنا مکان واپسی لے لے گا اور پھر وہ مکان یا دکان وسامان بدستور اس کی ملکیت میں آجائے گا۔ فقہاء اس قسم کی بیع اور معاملہ کو بیع وفا (بیع بہ شرط واپسی) کہتے ہیں۔ کیا شریعت کے اصول اور ضابطے کے مطابق اس طرح کی بیع اور لین دین درست ہے؟ کیا اس طرح کا معاملہ تقاضائے بیع کے خلاف نہیں ہے؟ کیونکہ شریعت کے اصول کے مطابق اگر کوئی ایسی شرط بیع میں لگائی جائے جو تقاضائے بیع کے خلاف ہو تو وہ بیع درست نہیں، (نهى رسول الله ﷺ عن بيع وشرط) صورتِ مسئلہ میں بھی یہ شرط لگائی گئی ہے کہ ایک مدت کے بعد وہ شئ واپس کر دینی ہوگی اور یہ بیع کے اصول اور تقاضوں کے خلاف ہے اس لیے اصلا یہ بیع درست نہیں ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں احقر کے نام اکیڈمی کی جانب سے جو سوالات آئے ہیں ذیل میں ان سوالات کے جوابات لکھے جارہے ہیں۔ بیع وفا کی تعریف، شرعی حکم اور سوالات کے تفصیلی جوابات سے پہلے بیع وفا کا اجمالی شرعی حکم پیش کر دینا مناسب ہوگا تاکہ اس کی روشنی میں آگے کے سوالات کے جوابات لکھنے میں آسانی ہو۔

بیع وفا کا حکم اور اس کا اجمالی تعارف:

''بیع وفا'' ایک ایسا عقد ہے جس میں بائع یہ شرط لگاتا ہے کہ جب وہ مشتری کی ثمن لوٹا دے گا تو مبیع اسے واپس کر دی جائے گی، چاہے ثمن نقد کی صورت میں ہو یا دین (قرض) کی صورت میں۔ ''بیع وفا'' اپنی شکل وصورت کے لحاظ سے بیع کی طرح ہے اور اس کا تقاضہ ہے کہ اسے نافذ ولازم قرار دیا جائے کیونکہ اصولی اعتبار سے معاملۂ بیع بقاودوام کا مقتضی ہوتا ہے۔ اس عقد کا طبعی تقاضا ہے کہ عقد کے بعد فروخت کی گئی شئ (مبیع) حتمی اور یقینی طور پر فروخت کنندہ (بائع) سے خریدار (مشتری) کی ملکیت میں آجائے۔ یہاں چونکہ اس معاملے کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی گئی ہے کہ ایک مدت کے بعد وہ شئ واپس کر دینی ہوگی اور یہ بیع کے اصول اور تقاضوں کے خلاف ہے۔ اس لیے بیع درست نہیں۔ البتہ عملا اس بیع کی صورت بالکل رہن کی سی ہے اور فقہاء نے بھی ایک طرف اس کے غیر معمولی تعامل اور دوسری طرف فقہی قباحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کو رہن کی حیثیت سے جائز رکھا ہے۔ اگر اس معاملہ کو رہن قرار دیا جائے تو اس کا صاف مطلب ہوگا کہ وہ شخص جو

خریدار ہے اس کا مالک نہیں ہوگا، اصل مالک بائع ہے۔ اسی طرح خریدار کے لئے زمین یا مکان فروخت ہو تو حق شفعہ اصل مالک ہی کو ہوگا۔ اس خریدار کو جس کی حیثیت دراصل رہن رکھے گئے مال کے امین کی ہے اور جسے فقہ کی اصطلاح میں مرتہن سے تعبیر کیا جاتا ہے اس سے استفادہ کا کچھ حق نہیں ہوگا۔ ردالمختار میں ہے۔

''البیع الذی تعارفه اهل زمننا احتیالا لربا وسمّوه ببیع الوفا وهو رهن فی الحقیقة لا یملکه ولا ینتفع له إلا باذن مالکه وهو ضامن لما أکل من ثمرة وأتلف من شجرة ''وہ بیع جس کا آج کل ہمارے زمانے میں سود سے بچنے کے لئے حیلہ کیا جارہا ہے اور اسے بیع وفا کہا جاتا ہے، درحقیقت رہن ہے جس کا خریدنے والا نہ مالک ہوتا ہے اور نہ اس سے نفع اٹھا سکتا ہے'' اگر پھل میں سے کھائے گا یا کسی درخت کا نقصان کرے گا تو وہ شخص (مرتھن یعنی خریدار) ضامن ہوگا۔ (ردالمختار ۴/۳۴۶)

بیع وفا کی تعریف

بیع وفا کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں (زیادہ تر تعریفات باہم متقارب ہیں صرف تعبیرات کا فرق ہے) بیع الوفا کی چند تعریفیں ذیل میں پیش کی جارہی ہیں۔

''بیع الوفا'' یہ ہے کہ کسی چیز کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جائے کہ جب بائع (فروخت کنندہ) ثمن مشتری (خریدار) کو لوٹا دے گا تو مبیع اسے واپس کردی جائے گی۔ (مباحث فقہیہ ص ۴۰۸)

مجلّہ عثمانیہ (۱۱۸) میں ہے، بیع الوفا یہ ہے کہ مال کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جائے کہ جب ثمن واپس کردے گا تو مشتری اسے مبیع لوٹا دے گا۔ (شرح المجلہ ص ۶۷ بحوالہ مباحث فقہیہ) بیع وفا کی جامع تعریف یہ کی گئی ہے کہ ''بیع الوفا'' ایک ایسا عقد ہے جس میں بائع یہ شرط لگاتا ہے کہ جب وہ مشتری کو ثمن لوٹا دے گا تو مبیع اسے واپس کردی جائے گی، چاہے ثمن نقد کی صورت میں ہو یا دین (قرض) کی صورت میں، (نظریۃ العرف ص ۱۱۸ بحوالہ مباحث فقہیہ ص ۴۰۹) بیع الوفا کی اس تعریف میں اُعیان منقولہ اور غیر منقولہ سب شامل ہیں البتہ شیخ مصطفیٰ زرقاء کے نزدیک بیع الوفا عقار (غیر منقولہ اشیاء) کے ساتھ خاص ہے لہذا منقول کے اندر بیع الوفا کی صورت اس سے خارج ہوگی۔

فقہاء کے یہاں بیع وفا کے نام

بیع وفا چونکہ دیگر بیوع لازمی سے علیحدہ نوعیت کی ہے اس لیے فقہاء نے اس کے نام بھی مختلف رکھے ہیں، عام طور پر فقہاء اسے ''بیع الوفا'' کا نام دیتے ہیں اور یہ نام اس لیے ہے کہ خریدار پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس وعدے کو پورا کرے جو اس نے بائع سے کر رکھا ہے کہ وہ ثمن واپس کرے گا تو یہ مبیع واپس کرے گا۔ اہل قاہرہ اسے ''بیع الأمانۃ'' کہتے ہیں، عثمان زیلعی (متوفی ۷۴۳ھ) نے البحر الرائق میں اسے لکھا ہے۔ اس بیع کو ''رہن معاد'' بھی کہا جاتا ہے اور شوافع کے یہاں اس کو رہن معاد ہی کہا جاتا ہے۔ بعض ائمہ نے اس عقد کا نام بیع الطاعۃ رکھا ہے، جبکہ اہل شام اسکو ''بیع الإطاعۃ'' کہتے ہیں صاحب ہدایہ نے اسے ''البیع الجائز'' کا نام دیا ہے، مشرقی ہندوستان میں اسے بیع میعادی کہا جاتا ہے اور اسی نام سے یہ عقد لوگوں میں معروف ہے۔

(مستفاد مباحث فقہیہ ص ۴۰۵-۴۰۶)

فقہاء کے مذاہب میں بیع وفا کا تذکرہ

قاضی مجاہدالاسلام قاسمی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:

''اس عقد کا تذکرہ فقہاء حنفیہ کی کتابوں میں شرح وبسط کے ساتھ ملتا ہے، باقی فقہاء مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی جتنی کتابیں ہیں، ان میں صراحۃ وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر مجھے نہیں ملا، البتہ ابن قدامہ حنبلیؒ نے ''المغنی'' میں بیع کی ایک صورت ذکر کی ہے۔ جس میں قرض سے انتفاع کے لئے بطور حیلہ خیار کی شرط لگائی ہوتا کہ مشتری مبیع سے غلہ اور نفع حاصل کرتا رہے، اور جب ثمن اسے واپس کر دی جائے تو وہ بھی مبیع لوٹا دے، پھر ابن قدامہ نے اس کا حکم لکھا ہے اور یہی بیع الوفا ہے، اگر چہ انہوں نے بیع الوفا کے نام سے اس کو ذکر نہیں کیا ہے اور نہ ہی دوسرے نام سے، اسی طرح علامہ ابن حجر ہیتمی شافعی نے ''الفتاوی الکبری'' میں ذکر کیا ہے کہ جب ان سے یہ سوال کیا گیا کہ ''بیع الناس'' کا حکم کیا ہے تو انہوں نے فرمایا: اگر ''بیع الناس'' سے عقد کی وہ صورت مراد ہے جس میں لوگ کسی شئ کو اس کے ثمن مثل سے کم میں فروخت کرنے پر اتفاق کر لیتے ہیں اور یہ کہ جب بائع ثمن لوٹا دے گا تو اسے ''عین'' یعنی مبیع بھی واپس کر دی جائے گی (الفتاوی الکبری) یہ بھی بیع الوفا ہی کی ایک صورت ہے'' (مباحث فقہیہ ۴۰۶)

بیع وفا کا محل وقوع کتب حنفی میں

بیع وفا کا ذکر قدیم فقہاء احناف کے یہاں نہیں ملتا، عام طور پر متأخرین فقہاء اُحناف کے یہاں اس کا ذکر ملتا ہے۔ بعض فقہاء احناف نے اسے بیع فاسد کے باب میں بیان کیا ہے، بعض نے باب الخیارات میں، بعض نے کتاب الإکراہ میں، کسی نے ''تذنیب'' کے عنوان کے تحت تو کسی نے باب البیعات المکروہۃ والأرباح الفاسدۃ کے عنوان کے تحت، جبکہ الاشباہ میں العادۃ محکمۃٌ کے قاعدہ کے تحت عرفِ عام اور عرف خاص کے ذیل میں اس کا تذکرہ آیا ہے اور ابن نجیمؒ نے ''البحر الرائق'' میں تحریر کیا ہے کہ باب الخیارات میں اس عقد کا تذکرہ زیادہ مناسب ہے کیوں کہ بیعِ وفا خیار عقد کی ہی ایک صورت ہے۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے مباحث فقہیہ ۴۰۶-۴۰۷)

بیع وفا کی ابتداء کب سے ہوئی؟

اس بیع کا تذکرہ قدیم فقہاء اُحناف کے یہاں نہیں ملتا، اس عقد کا تذکرہ پانچویں صدی ہجری کے آخری زمانے میں ملتا ہے، مصطفیٰ احمد زرقاء نے اپنی مشہور کتاب ''المدخل الفقہی العام'' میں لکھا ہے۔ کہ: پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں بخارا میں اس بیع کا رواج ہوا، اس کے رواج کی تاریخ پر دلیل یہ ہے کہ امام نجم الدین ابوحفص عمر بن محمد نسفیؒ نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے کہ ہمارے اہل زمانہ سود سے بچنے کے لئے جو عقد کرتے ہیں اسے وہ ''بیع الوفا'' کہتے ہیں۔ جو حقیقت میں ''رہن'' ہے اور امام نجم الدین کی ولادت ۴۶۱ھ اور وفات ۵۳۷ھ میں ہوئی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ''بیع الوفا'' کا رواج پانچویں ہجری کے اواخر میں ہوا ہے، نہ کہ اس سے پہلے۔ (المدخل ۱/۲۰۵ بحوالہ مباحث فقہیہ ۴۰۸)

خلاصہ یہ ہے کہ اس بیع کا رواج سمرقند وبخاری میں پانچویں صدی ہجری کے اوائل یا اس سے پہلے ہوا ہے، چنانچہ حنفیہ اس بیع کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس بیع کا عموم و شیوع امام سید ابوشجاع اور امام علی السغدی وماتریدی کے عہد میں ہوا۔ (ردالمحتار ۴/۲۴۶ بحوالہ مباحث فقہیہ ص ۴۰۸)

بیع وفا کی تعریف، اجمالی حکم، فقہاء کے یہاں اس کے نام، فقہاء کے مذاہب میں اس کا تذکرہ، اس بیع کا محل وقوع، کتب حنفی میں اس کا محل وقوع اور اس بیع کی ابتداء کب سے ان تفصیلات کو ذکر کرنے کے بعد اب اکیڈمی کے جانب سے آئے سوالات کے جواب لکھے جارہے ہیں۔

بیع وفا دراصل رھن ھے

سوال نمبر۱ کا جواب:

''بیع الوفا'' حقیقت کے لحاظ سے رہن ہے۔ اور فقہاء نے اس کو رہن کی حیثیت ہی سے جائز رکھا ہے، اس لیے اس پر بیع کے احکام جاری نہیں ہوں گے بلکہ رہن کے احکام جاری ہوں گے، وہ احکام یہ ہیں: مشتری بیع کا مالک نہیں ہوگا۔ بائع کی اجازت کے بغیر اس سے انتفاع بھی نہیں کرسکتا۔ اس کے منافع کو اگر استعمال کرے، یا مبیع درخت ہو اسے تلف کردے تو وہ اس کا ضامن ہوگا۔ مبیع کے ہلاک ہونے کی صورت میں بائع سے دین ساقط ہوجائے گا۔ اگر مبیع کی مالیت مقدار دین سے زائد ہوتو ہلاک ہونے کی صورت میں زائد کا تاوان اس پر واجب نہیں ہوگا (صرف دین ساقط ہو جائے گا) جیسا کہ امانت میں ہوتا ہے۔ جس وقت بائع قرض ادا کردے مبیع اسے لوٹا دی جائے گی۔ اسی طرح زمین یا مکان وغیرہ فروخت ہوتو حق شفعہ اصل مالک ہی کو ہوگا۔ اس خریدار کو جس کی حیثیت دراصل رہن رکھے گئے مال کے امین کی ہے اور جسے فقہ کی اصطلاح میں مرتہن سے تعبیر کیا جاتا ہے اس سے استفادہ کا کچھ حق نہیں ہوگا کیوں کہ مال مرتہن سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔

بیع وفا میں (مبیع) مالِ مرتھن سے فائدہ اٹھانے کا حکم

سوال نمبر۲ کا جواب:

(الف) اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جب تک بیچنے والا اسکو واپس نہ لے اس وقت تک خریدار کے پاس وہ مالِ مرتھن کے حکم میں ہے اس لیے اس سے فائدہ اٹھانا از روئے شریعت جائز نہیں ہوگا۔ لیکن اگر بیع وفا میں عقد کے وقت مبیع سے انتفاع کی کسی جہت سے کوئی شرط نہیں لگائی اور بعد میں بائع نے اپنی خوشی سے انتفاع کی اجازت دے دی تو ایسی صورت میں احقر کے نزدیک مشتری کے لئے شئ مرہون سے انتفاع کی اجازت ہونی چاہئے، کیوں کہ بعض علماء نے عقد رہن میں اس صورت میں شئ مرہون سے انتفاع کی اجازت دی ہے جبکہ بعض علماء کے نزدیک اس صورت میں بھی انتفاع ناجائز ہے۔ البتہ اگر شئ مرہون سے انتفاع کا رواج عام ہوتو ''المعروف کالمشروط'' کے تحت بیع وفا میں بھی عقدِ رہن کی طرح مرتھن سے انتفاع جائز نہیں ہوگا۔

البتہ اگر بیع وفا کو اجارہ کی شکل دے دی جائے (عقار وغیرہ میں) تو اس صورت میں زمین، مکان وغیرہ سے انتفاع کی شکل نکل سکتی ہے اور وہ از روئے شریعت درست اور جائز بھی ہوگی۔ مثلاً اگر روپئے قرض دینے والا روپئے بطور قرض دے دے اور قرض لینے والا قرض دینے والے کو اپنی زمین دے، اور ان دونوں کے درمیان اجارہ کی تمام شرطوں کے ساتھ معاملہ طے پائے کہ اتنے دنوں کے لئے زمین لی جارہی ہے، اس کی اجرت متعین ہوجائے کہ اس کی سالانہ یا ماہانہ اجرت اتنی ہوگی، خواہ وہ روپئے کی شکل میں ہو یا غلہ کی شکل میں ہو، تو اس طرح اس زمین سے قرض دینے والے کے لئے فائدہ اٹھانا شرعاً جائز اور درست ہوگا، اس لیے کہ اس صورت میں شئ مرہون سے انتفاع نہیں ہوا بلکہ اجارہ کی صورت میں اس کی اجرت دے کر فائدہ اٹھانا ہوا جو جائز ہے۔ اب خواہ اجرت کی رقم قرض دینے والا مالک زمین کو دیتا رہے یا قرض کی رقم سے منہا کراتا رہے دونوں صورتوں صحیح ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلامی قانون کے مطابق رہن رکھی جانے والی چیز کی حیثیت محض ایک ضمانت کی ہوتی ہے اور زمین رکھے جانے کے بعد وہ شئ اصل مالک کی ملک ہوتی ہے اسی طرح اس شئ میں اضافہ یا جو کچھ نفع ہو وہ بھی اصل مالک کی ملک قرار پاتی ہے، البتہ شئ مرہون کی حفاظت، افزائش وغیرہ میں جو اخراجات آئیں گے وہ سب (بائع) اصل مالک کو دینا پڑے گا۔ اگر شئ مرہون کے طور پر گھر ہو تو متقدمین فقہاء قرض دینے والے کو اس سے استفادہ کی اجازت دیتے تھے، البتہ فقہاء متأخرین کے یہاں اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے کیون کہ اس زمانے میں اس کی حیثیت قرض دہندہ کی طرف سے ایک طرح کی شرط کی ہوتی ہے اور فقہاء کا اصول ہے ''المعروف کالمشروط'' کہ جو چیز عرف ورواج کی حیثیت اختیار کرلے وہ شرط کا درجہ اختیار کرلیتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(ب) بیع وفا میں خریدار (قرض دھندہ) کے مکان کا کم کرایہ ادا کرنے کا حکم

اگر بیع وفا میں قرض دہندہ کو بائع نے مکان بیچا ہے جو مکان کہ مشتری (قرض دہندہ) کے پاس بطور رہن ہے اب اگر مشتری کو کرایہ پر مکان کی ضرورت ہے تو اس مکان کو مروجہ کرایہ پر لے تو لینا جائز ہوگا، لیکن اگر خریدار مروجہ کرائے سے بہت کم کرایہ دیتا ہے تو شرعاً یہ جائز نہیں ہے، کیوں کہ حدیث میں قرض دے کر اس قرض کی بنیاد پر نفع اٹھانا ناجائز ہے "کل قرض جر به نفعا فهو ربا" البتہ اگر بائع اپنی رضامندی سے بغیر کسی خارجی یا داخلی دباؤ کے محض اپنی طرف سے یہ سوچ کر کہ " هل جزاء الإحسان إلا الاحسان " قرآنی ضابطہ ہے کرایہ کم لے تو کچھ بھی حرج نہیں ہونا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب

عام حالت میں کم کرایہ ادا کرنا گویا قرض سے فائدہ اٹھانا ہے جو سراسر ناجائز ہے، علامہ ابن عابدین شامیؒ نے فتح القدیر سے نقل کیا ہے لا يحل له أن ينتفع بشئ منه بوجه من الوجوه وإن اذن له الراهن لأنه اذن فی الربا ..... الغالب من احوال الناس أنهم يزيدون عند الدفع الإنتفاع ولو لاه لما أعطاه الدراهم وهذا بمنزلة الشرط لأن المعروف كالمشروط (خلاصۃ الفتاویٰ ۱۸۶/۴ بحوالہ جدید فقہی مسائل صفحہ ۴۲۶ جلد ۱)

(ج) اگر اس عرصہ میں خریدار اس شئ سے کسی طرح کا فائدہ (کاشت کا یا اجارہ داری وغیرہ) اٹھانا چاہے تو از روئے شرع اس کی گنجائش نہیں ہوگی کیونکہ یہ بھی قرض دے کر اس سے فائدہ اٹھانے کی طرح ہے جس کی حدیث میں ممانعت آئی ہے (البتہ عقد اجارہ کے طور پر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے فائدہ اٹھا سکتا ہے) واللہ اعلم بالصواب

(د) خریدار کو اس کو (مبیع) بیچنے کا حق نہیں ہے کیوں کہ بیع وفا میں مبیع مشتری کے پاس امانت ہے اور امانت کو بغیر مودع کی اجازت کے بیچنا شریعت میں درست نہیں ہے۔ اور پھر بیع وفا میں اس کی گنجائش کیوں کر ہوسکتی ہے کہ بائع مبیع کو اپنی ملکیت سے نہ نکلنے دینے ہی کی وجہ سے بیع وفا کر رہا ہے کہ مشتری اس کو کسی دوسرے سے فروخت نہ کرے۔ ورنہ بیع وفا کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔

البتہ اگر اس درمیان بائع اس کو بیچنے کی اجازت دے دے تو وہ اس سامان کو فروخت کرسکتا ہے۔ اگر اس نے قیمت متعین کردی، اور مشتری نے اس سامان کو اس سے زیادہ قیمت میں فروخت کردیا تو وہ قیمت یا فائدہ مشتری کا ہوگا اور اس میں کوئی

حرج بھی نہیں ہے۔ اگر مشتری نے بائع کی مرضی کے بغیر اس کو فروخت کر دیا تو یہ بیع موقوف کے درجہ میں ہے، اگر بائع بغیر کسی دباؤ اور ڈر کے اس کی اجازت دے دے تو یہ بیع درست ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

کثیر رقمِ ضمانت کی وجہ سے کم کرایہ پر معاملہ طے کرنا

سوال نمبر ۳ کا جواب

آج کل پوری دنیا میں اور خاص طور پر بڑے شہروں میں یہ معاملہ عام ہے کہ کثیر رقم ضمانت اور اسی نسبت سے کم کرایہ پر معاملہ طے کیا جاتا ہے، مثلا ایک دکان یا مکان پر دس لاکھ روپئے رقم ضمانت حاصل کی جاتی ہے اس کا مروجہ کرایہ دس ہزار روپئے ماہانہ ہونا چاہیے لیکن مالک پانچ سو روپیے یا ایک ہزار روپیے کرایہ لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے کیوں کہ اسے کاروبار یا کسی ضرورت کے لئے زر ضمانت کے نام پر بڑی رقم حاصل ہو جاتی ہے، تو کیا از روئے شرع یہ معاملہ درست ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ زر ضمانت کی حیثیت قرض کی ہوگی، قرض دے کر اس سے فائدہ اٹھانا از روئے شرع درست نہیں ہے، اور اگر زر ضمانت کی حیثیت امانت و رہن کی مان لیا جائے تو بھی امانت اور رہن سے فائدہ اٹھانا درست نہیں ہے۔ لیکن آج کل یہ صورت عموم بلوئ کی شکل اختیار کر چکی ہے اور لوگوں کا تعامل اس پر بہت زیادہ ہے اس لیے علماء کرام کو اس مسئلہ پر نئے زاویئے سے سوچنا ہوگا اور " الحرج مدفوع شرعاً " کے ضابطہ کو سامنے رکھ کر مسئلہ کو حل کرنا پڑے گا۔

احقر کی رائے میں اگر مکان و دکان کا مالک قرض دہندہ کی کثیر رقم ضمانت سے فائدہ اٹھا رہا ہے اور اپنے کاروبار کو وسعت دے رہا ہے اور کثیر رقم ضمانت کے بے پناہ اور اتاہ فائدہ ہی کی بنیاد پر وہ مروجہ کرایہ سے کم لینے پر راضی ہے اور اس کے اس پر راضی ہونے سے (اس کا) نقصان بھی نہیں ہو رہا ہے بلکہ دوسری طرف سے اس کی کما حقہ بھرپائی ہو رہی ہے، اس لیے اس کثیر رقم ضمانت کی بنیاد پر کرایہ میں کی جانے والی کمی جائز ہونی چاہیے اور اسے قرض سے فائدہ اٹھانا نہیں سمجھا جانا چاہیے، اس طرح کا معاملہ کرنے میں کوئی غرر اور دھوکہ بھی نہیں ہے۔ اور فقہی قاعدہ "لا ضرر ولا ضرار" کے ضمن میں بھی نہیں آتا بلکہ شریعت میں ایسے موقع پر گنجائش اور وسعت کی راہ دی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔ یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر، لا یکلف الله نفسا إلا وسعها۔ ما جعل الله علیکم فی الدین من حرج۔ فقہاء نے ایسے ہی مواقع کے لیے مندرجہ ذیل قواعد کو مستنبط کیا ہے۔ المشقة تجلب التیسر، إذا ضاق الأمر اتسع وإذا اتسع ضاق، الضرر یزال ، الضرورات تبیح المحظورات۔ الحاجة تنزل منزلة الضرورة۔

البتہ یہ آسانی مبتلی بہ کی حالت اور پوزیشن کو دیکھتے ہوئے دی جائے گی کہ اگر قرض دے کر فائدہ اٹھانا کسی کی مجبوری اور کسی کی غربت سے فائدہ اٹھانے پر مبنی ہو تو اس صورت میں اس کی اجازت تو بالکل نہیں ہوگی کہ سود کی حرمت کی یہ ایک بڑی وجہ ہے۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر یہ دیکھا جائے گا کہ کرایہ کم کرنے پر کیا وہ مجبور ہے اور اس مجبوری کا فائدہ قرض دہندہ اٹھا رہا ہے؟ تو اس صورت میں یہ معاملہ درست نہ ہوگا۔

واللہ اعلم بالصواب

☆☆☆

فریضۂ دعوت

نہ ہو نومید ، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے

(ملک کے انتخابی نتائج:۔ دعوتی نقطۂ نظر سے بعض تشویشناک پہلو)

محمد الیاس محی الدین ندوی بھٹکلی

دنیا میں فیصلے خوش فہمیوں پر نہیں حقائق پر ہوتے ہیں: ۔ ملک میں انتخابات کے عوام کے لیے غیر متوقع لیکن خواص کے لیے عین متوقع نتائج پر جو تبصرے اور تجزیے مجموعی طور پر سننے ،دیکھنے اور پڑھنے کو مل رہے ہیں وہ بحیثیت مسلمان اور امت دعوت حیرت میں ڈالنے والے ہیں ،اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ بلیٹ مشینوں میں ہیرا پھیری ہوئی اور یہ اسی کا نتیجہ تھا، بعضوں کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے آپسی انتشار اور ان کے ووٹوں کی تقسیم نے زعفرانی پارٹی کو اکثریت میں پہنچایا، کچھ کا کہنا ہے کہ کانگریس کے خلاف عوام کا غصہ تھا، اس کو ہرانا تھا چونکہ اس کے مقابلہ میں کوئی بڑی جماعت نہیں تھی، اس لیے اتفاق سے بھگوا جماعت کو اکثریت مل گئی ، کچھ ملّی قائدین مسلمانوں کو تسلّی دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف یہ ان کا وقتی اتحاد ہے ،خود ان میں اس قدر خلفشار ہے کہ چند ہی دنوں میں یہ لوگ آپس میں لڑ جھگڑ کر اقتدار سے محروم ہو جائیں گے۔

مسلمانوں کو درحقیقت اسلامی تاریخ میں اسی طرح کی خوش فہمیوں اور غیر حقیقی توقعات نے نقصان پہنچایا ہے، انسان کو اپنی کمزوریوں اور شکست کا جائزہ لینے ،غلطیوں کا احساس دلانے اور کمیوں وخامیوں کا اعتراف کرانے اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کرانے میں یہی توقعات اور خوش فہمیاں رکاوٹ بنتی ہیں، اس لیے دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان حقیقت پسند بنے اور اپنے اوپر آنے والے مسائل کے محرّکات کا جائزہ لے اور اس کی روشنی میں اپنی اصلاح کی کوشش بھی کرے اور آئندہ کی منصوبہ بندی بھی۔

بحیثیت امت دعوتِ ان نتائج کا ہمیں کس طرح تجزیہ کرنا چاہیے: ۔ ہم امت دعوت ہیں، ہم صرف بصارت ہی نہیں بصیرت کے بھی حامل ہیں، ذہانت ہی ہمارا امتیاز نہیں بلکہ فراست بھی ہماری پہچان ہے، ہم فقہ سے ہی نہیں بلکہ تفقہ سے بھی آراستہ ہیں ،اس لیے ہمیں دل کی آنکھوں سے اپنے اوپر آنے والے ان منفی حالات کا تجزیہ کرنے اور اس کے تدارک کی کوشش کرنی چاہیے، اس پوری دنیا میں خالص توحید کے علمبردار ہونے اور اللہ تعالی کی سب سے محبوب امت ہونے کے باوجود ہم کو اس طرح شرمناک صورت حال کا سامنا کیوں کرنا پڑا؟ اللہ تعالی نے ہم پر ان ظالم حکمرانوں کو کیوں مسلط کیا؟ اس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے، مساجد، دینی مدارس ،اسلامی تحریکات ،تنظیموں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور بظاہر اس کے نظر آتے مثبت اثرات کے باوجود ملّی اتحاد سے ہم آخر کیوں دور ہوتے جارہے ہیں؟

ملّی اتحاد کے لیے کی جانے والی کوششیں کیوں کارگر نہیں ہورہی ہیں، ذاتی مفادات اور نفسانی اغراض نے ہم میں انتشار کی یہ کیفیت کیوں پیدا کی ہے؟ اس کے وجوہات واسباب کا ہمیں سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہیے، اگر پورے قرآن مجید پر نہ سہی صرف چند آیات پر بھی ہماری نظر ہو تو اس کے اصل محرّک اور سبب کو جاننے میں ہمیں دیر نہیں لگے گی۔

اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ ظالم حکمرانوں کے تسلط کی شکل میں مسلمانوں کو اللہ تعالی کی طرف سے سزا ان کی بداعمالی ہی کی وجہ سے دی گئی ہے معاملہ جب حد سے آگے بڑھتا ہے تبھی بے پناہ رحم کرنے والے رب کی طرف سے سخت دل لوگوں کو اہل ایمان پر مسلط کیا جاتا ہے، اسی لیے ہمیں دربار نبوت سے ہمیشہ یہ دعا کرنے کے لیے کہا گیا ہے ، اے ہمارے رب:۔ ہمارے گناہوں اور کرتوتوں کی پاداش میں ہم پر بے رحم وظالم حکمرانوں کو مسلّط نہ فرما:''**اللّھمّ لاتسلّط علینا بذنوبنا من لایخافک فینا ولایرحمنا**'' دراصل اس معجزانہ دعا کے اندر ہی ہمیں اس وقت ملک میں ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں درپیش ناگفتہ بہ حالات کے اسباب کے ساتھ اس کا علاج بھی بتایا گیا ہے کہ ہمارے گناہوں اور کرتوتوں کی پاداش ہی میں یہ ظالم حکمراں ہم پر مسلط کئے گئے ہیں، اس سے نجات کا واحد راستہ اللہ تعالی سے اپنے تعلق میں استحکام، اپنی اصلاح اور اپنے اعمال واخلاق کی درستگی ہے۔

امت کی اخلاقی حالت بھت تشویشناک ھے : ۔ گذشتہ چند دہائیوں سے پورے عالم اسلام بالخصوص برصغیر میں مسلمانوں کی ظاہری دینی حالت میں تو برابر ترقی ہورہی ہے، جتنی مساجد پچھلے بیس پچیس سالوں میں تعمیر ہوئی ہیں وہ گذشتہ سو سالوں میں نہیں ہوئی ہیں، ربع صدی میں دینی مدارس کے بچھنے والے جال نے دوصدیوں کا ریکارڈ توڑ دیا ہے اس کے باوجود اندرونی وروحانی اور باطنی اعتبار سے امت کا حال بڑا تشویشناک ہے، عبادات میں دلچسپی تو بڑھ رہی ہے لیکن اس کی روح ختم ہورہی ہے، پہلے جمعہ کے دن دو تین گھنٹہ پہلے ہی جامع مسجدیں بھر جاتی تھیں، لیکن آج اذان جمعہ کے وقت بھی مشکل سے دو ایک صف لوگ جامع مسجد میں نظر آتے ہیں، پہلے تو پنج وقتہ نمازوں میں اذان سے پہلے ہی لوگ مسجدوں کا رخ کرتے تھے اور نماز کے بعد بھی سنتوں، ذکرواذکار اور دعاؤں میں بڑی دیر تک مشغول رہتے تھے، اب تو اقامت کے وقت حاضری ہوتی ہے اور سلام پھیرتے ہی آدھی سے زیادہ مسجد خالی ہوجاتی ہے، سنتوں، دعاؤں اور ذکرواذکار کا کہنا ہی کیا اعلیٰ تعلیم کے چکّر میں مشنری اور غیر اسلامی اسکولوں میں ہمارے بچوں کی تعلیم نے ان کو اسلام وعقیدہ کے متعلق شکوک وشبہات میں مبتلا کردیا ہے اور وہ ذہنی وفکری اعتبار سے اسلام سے خارج ہورہے ہیں، لیکن افسوس نہ صرف ان بچوں کو بلکہ ان کے والدین کو بھی احساس نہیں ہورہا ہے کہ ان کا معصوم بچہ فکری اعتبار سے مرتد ہوکر خارج اسلام ہوچکا ہے، غیر مسلم ہی نہیں بلکہ اکثر مسلم تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم نے اخلاقی انارکی کی انتہا کردی ہے، جس کے نتیجہ میں بڑے شہروں کے مسلم گھرانوں میں بھی محبت کی شادیوں یعنی کورٹ میریج کا تناسب 25 فیصد سے زیادہ ہوگیا ہے، اس میں بھی 5 فیصد سے زائد مسلم طلبا وطالبات غیر مسلموں کے ساتھ شادیوں کے بندھن میں بندھے جارہے ہیں اور طرفہ تماشا یہ کہ دونوں اپنے اپنے مذاہب پر قائم ہیں اور ان سے

پیدا ہونے والی اولادوں کا دور دور تک اسلام سے واسطہ نہیں ہے، اونچی تعلیم کے شوق بلکہ فیشن نے اپنے گاؤں سے باہر بڑے شہروں میں اپنے بچوں کو پڑھانے اور ان کو ہوسٹلوں میں رکھنے کے چکّر میں ان کو حیا سوز ہی نہیں بلکہ ایمان سوز مراحل میں داخل کر دیا ہے اور سالوں کی محنت سے ہماری نگرانی میں پلنے والا ہمارا بچہ منٹوں میں ہمارے ہاتھ سے نکل کر ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ پوری قوم وملت کے لیے بدنامی کا سامان کر رہا ہے، آپسی مسلکی تشدّد نے جنگ وجدال کی شکل اختیار کر لی ہے، مذہب کے بجائے مسلک کی تبلیغ اور تشہیر پر ہماری پوری توانائی صرف ہو رہی ہے، سودی کاروبار کو حرام سمجھنے کا آخری مرحلہ بھی اب ختم ہو رہا ہے، اچھی مالی حیثیت کے باوجود بینکوں سے قسطوں پر گاڑیاں خریدنے میں اب ہم عار بھی محسوس نہیں کر رہے ہیں، انشورنس جو جوے ہی کی ایک شکل ہے اور جس کی سخت ترین حرمت قرآن مجید میں موجود ہے، اب اتنا عام ہو گیا ہے کہ اپنی گاڑیوں پر انشورنس وصول کرنا اور استعمال کرنا دیندار طبقہ کے نزدیک بھی معیوب نہیں رہا ہے۔

غرض یہ کہ ہم میں وہ کونسی برائی اور خرابی موجود نہیں ہے جس سے بچنے کی اللہ تعالی کی طرف سے قرآن مجید میں اور خود اپنے حبیب ﷺ کے ذریعہ ہمیں تاکید نہیں کی گئی ہے، ان سب مہلک بیماریوں اور گناہوں میں ہمارے ملوث ہونے کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ہم پر اللہ تعالی کا اس سے بڑھ کر عذاب آتا اور ہم کو اس دنیا میں ہی عبرت ناک سزا دی جاتی، لیکن یہ اللہ تعالی کی غیر معمولی رحمت ہے کہ اس نے محض اپنے فضل وکرم سے ابھی بھی ہماری ستّاری فرمائی ہے اور کسی بڑی سزا سے ہم کو اب تک دوچار نہیں کیا ہے۔

ملک کے انتخابی نتائج کا دعوتی تجزیہ

:۔ ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ ہمارے برادران وطن کی ایک بڑی تعداد نے اس زعفرانی جماعت کو اپنی اکثریت سے اقتدار تک پہنچا دیا ہے اور انھیں پورے ملک کے مجموعی طور پر 31% فیصد ووٹ حاصل ہوئے ہیں، ہمارے ملک کی آبادی ایک سو پچیس کروڑ بھی مان لی جائے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تقریباً انتالیس کروڑ یعنی تین سو نوّے ملین ہندوستانیوں نے اسلام اور مسلمانوں سے نفرت رکھنے والی پارٹی کو ووٹ دیا ہے، سوال یہ ہے کہ بارہ تیرہ سال پہلے کے گجرات کے انسانیت سوز ہندو مسلم فسادات کے باوجود اور ساری دنیا میں اس بات کو مجموعی طور پر تسلیم کئے جانے کے باوجود کہ یہ فسادات منصوبہ بند طریقہ پر ہوئے تھے اور اس بات کو جاننے کے باوجود کہ جو شخص صرف ایک چھوٹی سی ریاست میں باشندگان وطن کو آپس میں جوڑ کر نہیں رکھ سکا وہ پورے ملک کے ہم وطنوں کو کیسے جوڑ کر رکھ سکے گا ان انتالیس کروڑ ہمارے غیر مسلم بھائیوں نے ان کو کیوں ووٹ دیا، جبکہ اس جماعت کے عزائم صاف تھے، وہ کھل کر انتخابی جلسوں میں اس کا اعلان بھی کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو وہ یکساں سول کوڈ پر مجبور کر دیں گے، رام مندر تعمیر کریں گے، کشمیری مسلمانوں کو دیئے گئے خصوصی حقوق کا خاتمہ کریں گے، دوسرے الفاظ میں مسلمانوں کو وہ اس ملک میں دوسرے درجہ کا شہری بنا کر چھوڑ دیں گے، ان سے ان کے مذہبی حقوق چھینیں گے، ان کا جینا دوبھر کریں گے اور پُرسکون ماحول میں رخنہ ڈالیں گے، یہ سب جانتے ہوئے بھی ہمارے ہم وطنوں نے آخر ان کو حکومت کی باگ ڈور کیوں سونپی، ہمارا سوال یہ ہے کہ ہمارے خلاف چند لوگوں کے ان برے اور اسلام دشمن ارادوں پر ان انتالیس کروڑ

بندگان خدا نے لبیک کیوں کہا اور تائید کیوں کی جو چند سالوں سے نہیں بلکہ ہزار سالوں سے ہمارے ساتھ رہتے اور اٹھتے بیٹھتے ہیں ، دوسرے الفاظ میں ہمارے خلاف ان بھگوا طاقتوں کے ارکان نے جو منفی پروپیگنڈے کئے ،افواہیں پھیلائیں ہم کو ملک دشمن اور ہمارے اس مذہب اسلام کو جو سراپا امن وسلامتی پر مشتمل ہے تشدّد اور دہشت گردی کا مذہب ثابت کرنے اور اس کے متعلق غلط تأثرات ان کے ذہنوں میں پیوست کرنے کی جو کوششیں کیں اس میں وہ کیسے کامیاب ہوئے۔

ہمیں اس پورے تناظر میں خود اپنا جائزہ لینے کی اور ان حالات کا دعوتی تجزیہ کرنے ضرورت ہے کہ ان کی ان منفی کوششوں کے کامیاب ہونے میں ہمارا اپنا قصور کتنا ہے؟ اور ہم سے اس سلسلہ میں کہاں کوتاہی ہوئی ہے؟ ہم صدیوں سے ان کے ساتھ زندگی بسر کررہے ہیں ،اس کے باوجود وہ ہم سے بدظن ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں ان کے ساتھ ہمارے باہمی اشتراک کے باوجود ہم نے کبھی خود ان کو دنیا اور آخرت میں کامرانی سے ہمکنار کرنے والے سچے مذہب اور اس کائنات کے مالک حقیقی کا ان کے سامنے تعارف کرانے ،توحید ورسالت اور آخرت کی عقلی ،فطری اور منطقی ضرورتوں کو بیان کرنے کی کوشش نہیں کی ، ہم امت اجابت تو بن کر رہے ،امت دعوت کے اپنے فرض منصبی کو بھول گئے ،عبادت ومعاملات کے دینی وشرعی فرائض کو تو ہم اپنے مذہب کا جزء سمجھتے رہے لیکن دعوت وتبلیغ کے اپنے فرض عین کو بھول گئے ،درحقیقت دعوتی فرائض کی ادائیگی میں ہماری اسی کوتاہی نے آج اس ملک ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم میں ہمیں یہ ناگفتہ بہ دن دکھائے ،جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ان گئے گذرے حالات میں بھی ہمارے اس ملک سے بڑھ کر پوری عالمی سطح پر دعوت کے لیے موزوں کوئی اور ملک نہیں ہے ، یہاں کے باشندوں کو توحید ورسالت کے پیغام کو سمجھانا جتنا آسان ہے کسی اور ملک میں نہیں، جتنے نرم دل لوگ مجموعی طور پر ہمارے اس ملک کے ہیں کسی اور خطہ کے نہیں، یہ الگ بات ہے کہ پوری ہندوستانی اسلامی تاریخ میں نہ ہم نے اور نہ ہمارے مسلم حکمرانوں نے اس زریں دعوتی موقع سے فائدہ اٹھایا۔

ھردرد کی دوا ھے صلّ علی محمد: ۔ ہم نے اس سے پہلے ان ہی صفحات میں کچھ سالوں پہلے اس پورے تناظر میں جو بات کہی تھی آج بھی اسی کو دہراتے ہیں کہ اس ملک میں ہمارے ان سب مسائل کا جو اس وقت ہمیں در پیش ہیں اگر سنجیدگی سے تجزیہ کیا جائے تو اس کے پس پردہ صرف ایک محرک نظر آتا ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے ان کے دلوں میں موجود خدشات، شبہات اور غلط فہمیاں ہیں، اگر اس پر ہم سنجیدگی سے توجہ دیں اور ایک کامیاب حکیم کی طرح اصل مرض کی تشخیص کرتے ہوئے اس کے ازالہ کی کوشش کریں تو سرے سے ہمارے ان سب مسائل ہی کا خاتمہ ہوجائے۔

ہمیں جسم کی مختلف ظاہری بیماریوں کا علاج کرنے کے بجائے بدن میں پنپنے والے اس مرض کے ازالہ کی کوشش کرنی چاہیئے جس کی وجہ سے آئے دن نت نئے امراض کی طرح امت مسلمہ کے سامنے اس طرح کے مسائل آرہے ہیں، ہمیں حکمت عملی ،خیرخواہی اور ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ اپنے برادران وطن تک اس دعوت کو پہنچانا چاہئے جس میں خود ان کی ہمیشہ ہمیش کی کامیابی مضمر ہے، جدید ترقیات کی روشنی میں

اسلام کی حقانیت و ابدیت کو ثابت کرنا اس وقت جتنا آسان ہے ماضی کی تاریخ میں کبھی اتنا آسان نہیں تھا، اسی طرح ہمیں دعوت کے میدان میں جدید وسائل واسباب کا بھی شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے بھرپور استعمال کرنا چاہئے اور اپنے ان برادران انسانیت تک بھی توحید ورسالت اور آخرت کے دلائل پہنچانے چاہئیں جو کسی وجہ سے نہ ہمارے پاس آرہے ہیں اور خاص حالات کی وجہ سے ہم بھی ان تک نہیں پہنچ پارہے ہیں، آپ کہیں گے کہ نہ ہم ان کے پاس جاسکتے ہیں اور نہ وہ ہمارے پاس آرہے ہیں پھر ان تک اپنی بات پہنچانے کا کونسا طریقہ رہ جاتا ہے، ہم نے اعزاز دے کر اپنا پیغام سنانے کے لئے اپنے جلسوں میں ان کو مدعو کیا، وہ نہیں آئے، ہم نے ان تک قرآن پہنچانا چاہا، انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا، ہم نے پیام حق ان کو سنانا چاہا، وہ سننے کے لئے تیار نہیں ہوئے لیکن آپ کے ان سب دلائل کے باوجود ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس جدید ٹیکنالوجی کے دور میں ہم ان کے پاس گئے بغیر بھی ان تک اپنا پیغام پہنچا سکتے ہیں، ان کے نہ چاہتے ہوئے بھی اسلام کی حقانیت ان کی نظروں سے گذار سکتے ہیں اور غیر محسوس طریقہ پر بھی اللہ کا پیغام ان کو سننے پر مجبور کیا جاسکتا ہے، ٹرافک سگنل پر کچھ سکینڈ ہم رکتے ہیں، کیا دائیں بائیں بے ہودہ اشتہارات کی ہورڈنگ پر ہمارے نہ چاہتے ہوئے بھی نظر نہیں پڑتی؟ بریکنگ نیوز کے درمیان مختصر وقفہ میں کیا مخرب الاخلاق تصویریں ٹی وی چینلوں میں ہماری نظروں سے نہیں گذرتیں؟ کیا ہماری عدم خواہش اور منشا کے باوجود ہمارے موبائیل، واٹس آپ، ای میل اور فیس بک پر غلط پیغامات ہمیں موصول نہیں ہوتے؟ یہ الگ بعد ہے کہ ہم اس کو پڑھ کر بعد میں ڈیلیٹ بھی کردیتے ہیں لیکن نظر تو بہرحال اس پر پڑ ہی جاتی ہے، جب اہل باطل نہ چاہنے کے باوجود ہمیں اپنے نظریات اور افکار کو سننے اور دیکھنے پر مجبور کرسکتے ہیں تو ہم اہل حق اسی حکمتِ عملی، وسائل اور ٹیکنالوجی کو اپنا کر اس کائنات کے تنہا مالک کا ان ہی کی نجات و فلاح کا ابدی پیغام ان کی نظروں سے کیوں نہیں گذار سکتے؟ ہم دعوت کے میدان میں نت نئے تجربات سے کیوں پیچھے رہتے ہیں؟ ایک نئی جگہ ہم دوکان لگاتے ہیں، کیا دوکان کے نہ چلنے پر دو تین ماہ کے اندر ہی اپنی دوکان بند کردیتے ہیں؟ نہیں بلکہ ہم واقعی اگر تاجر ہیں تو پہلے مرحلے میں یہ سوچتے ہیں کہ ممکن ہے اسٹاف نااہل ہے، اس کو تبدیل کیا جاتا ہے، پھر بھی فائدہ نہیں ہوتا تو سوچتے ہیں شاید دوکان کا باہری منظر اور اندر کا فرنیچر گاہکوں کو ترغیب دلانے میں ناکام ہے، اس کو تبدیل کرتے ہیں، پھر بھی گاہک نہیں آتے تو دوکان کا ایٹم یعنی سامان ہی بدل دیتے ہیں، سال بھر کی کوششوں کے باوجود بھی جب مثبت اثرات نظر نہیں آتے تو دوکان ہی کو اس جگہ سے دوسری جگہ منتقل کردیتے ہیں، ان سب کوششوں کا بھی جب اثر نظر نہیں آتا تو جدید اور نئے تشہیری اسباب اختیار کرتے ہیں، یہاں تک کہ ایک دن وہ آجاتا ہے کہ رزّاق حقیقی آپ کے صبر وتحمل سے خوش ہوکر کاروبار میں اتنی ترقی سے نوازتے ہیں کہ آپ خود حیرت میں رہ جاتے ہیں لیکن افسوس ہمارا یہی دماغ جو تجارت میں نت نئے تجربات کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے دعوت کے میدان میں پرانے تجربات کے علاوہ کچھ نئے تجربات اور حکمت کے ساتھ اس میدان میں کچھ نئے اسباب کو اختیار کرنے کے متعلق سوچنا بھی گوارہ نہیں کرتا، اگر تجارت کی طرح ہمارا دل و دماغ بھی دعوت کے میدان میں استعمال ہونے لگے تو چند ہی سالوں

میں ہمارے اس ملک کی جو فضا ہوگی وہ نہ صرف مسرت آمیز بلکہ حد سے زیادہ خوش کن ہوگی ، برادران وطن کی نئی نسل کو جو اسکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم ہے اور جو کل کو جا کر حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے والے ہیں ابھی سے منصوبہ بندی کے ساتھ اسلام سے قریب کرنے کی کوشش کی جائے تو صرف دس سال کے بعد اس برصغیر کی اسلام کے حق میں جو پرامن فضا ہوگی وہ تصور سے زیادہ حیرت انگیز ہوگی، اپنے اس دعوتی فریضہ کی ادائیگی کے بغیر ہمیں اس ملک میں اپنے برادران وطن کی طرف سے اپنے اوپر ہونے والے ناگہانی مظالم کے باوجود اللہ تعالی کی مدد ونصرت کی امید نہیں رکھنی چاہئے، اس لئے کہ انسانوں کی نظروں میں تو وہ ظالم اور ہم مظلوم ہیں لیکن ان تک اسلام کی دعوت اور توحید کا پیغام نہ پہنچانے کی وجہ سے اللہ تعالی کے پاس وہ مظلوم اور ہم ظالم ہیں اور اس دعوتی فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کی تلافی کے بغیر ہم اللہ رب العزت کی مدد کے مستحق نہیں بن سکتے۔

نہ ھونومید ، نومیدی زوال علم وعرفاں ھے : ۔ ملک کے موجودہ حالات سے ہمیں گھبرانے کی ضرورت نہیں اسلامی تاریخ میں اس سے بڑھ کر ظالم وجابر خود مسلم حکمراں ہم پر مسلط ہو چکے ہیں، خود اس ملک میں بھی ہماری امت اس طرح کے دسیوں ظالم اصحاب اقتدار کا سامنا کر چکی ہے اور اہل اسلام ہر بار ایک نئے عزم کے ساتھ میدان عمل میں واپس آئے ہیں، ہمارے خلاف برے عزائم رکھنے والی یہی جماعت اس سے پہلے بھی اس ملک میں اقتدار میں آچکی ہے، آپ کہیں گے کہ پہلے وہ اکثریت میں نہیں تھے دوسرے کے تعاون سے حکومت میں آئے تھے اس لیے وہ اپنے برے عزائم کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے، لیکن اس مرتبہ خطرہ ہے کہ وہ ہمارے خلاف دستوری اعتبار سے ترمیم کر کے مسائل پیدا کریں اور یکساں سول کوڈ وغیرہ نافذ کریں۔

آپ یقین رکھیئے کہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے نام سے جب حالات بگاڑنے کی کوشش کی جائیگی تو 69 فیصد وہ ہمارے برادران وطن جنہوں نے ان کو ووٹ نہیں دیا ہے خود اس کی مخالفت میں اور ان کے عزائم کو ناکام کرنے کے لیے ہمیں میدان میں نظر آئیں گے اور ان کے برے مقاصد کی طرف بڑھتے قدم سے خود ہمارے ملک کا نظام اس طرح درہم برہم ہوجائے گا کہ خود ان کو اقتدار تک پہونچانے والے ان کے خلاف ہوجائیں گے۔

اسی طرح ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ نئی حکومت میں نظر آنے والے صرف چہرے بدلے ہیں ، اس کے پسِ پردہ انتظامی طور پر اعلی منصب پر فائز رہ کر جو ذہنیت اسلام کے خلاف کام کر رہی تھی پہلے بھی وہی لوگ تھے اور اب بھی وہی لوگ ہیں، کچھ دنوں پہلے ہماری ملک کے فوج کے سپہ سالار ریٹائرمینٹ کے بعد بھگوا جماعت میں شامل ہوئے اور اس کے ٹکٹ پر جیت کر پارلیمان میں پہنچے، عدالت کے کئی جسٹس اور I.A.S افسران نے اپنی سرکاری ملازمت کے اختتام پر کھلم کھلا ان کی حمایت کا اعلان کیا، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام سے نفرت رکھنے والی اس جماعت کو حکومت میں آنے سے اپنے نظریات کے نفاذ میں کوئی بڑی کامیابی نہیں ہوئی ہے، یہ کام تو وہ حکومت کے بڑے منصب پر فائز اپنے نمائندوں سے بہت پہلے ہی سے کر رہے تھے، اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ پہلے نفاق کے ساتھ کسی اور حکمراں جماعت کے واسطہ سے یہی

کام ہورہا تھا اور اب کھل کر اسلام دشمنی کے اظہار کے ساتھ یہ لوگ برسرِ اقتدار آئے ہیں، ان دونوں پہلے اور موجودہ حکمراں طبقات کی نکیل جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اس میں تبدیلی نہیں ہوئی ہے ، پالیسی کہیں بنتی ہے اس کا صرف نفاذ ہندوستان میں ہوتا ہے، پون صدی پہلے آر یس یس کی تأسیس کے بعد جو خاموش منصوبہ بندی مسلمانوں کے خلاف ہوئی تھی اور جس صبر وضبط کے ساتھ اس کے اثرات کے ظاہر ہونے کا انہوں نے انتظار کیا تھا، اس کا پھل آج ان کو ملا ہے، لیکن ہمیں اطمینان ہے کہ نفاق کی وجہ سے ہمارے لیے پہلے اس کا مقابلہ مشکل تھا اب اس کا مقابلہ ہمارے لیے آسان ہے، پہلے ہم غفلت میں تھے، اب ہم ہوش میں آگئے ہیں، پہلے ہم خوش فہمی میں تھے، اب حقیقت سے ہم واقف ہو چکے ہیں۔

انصاف کی شمعیں ٹمٹمارہی ہیں لیکن بجھی نہیں ہیں: ۔ اکشردھام مندر پر فدائی حملے میں حملہ آور سمیت ۳۳/ افراد ہلاک اور ۸۸/ زخمی ہوئے تھے، اس کے بعد دہشت گردی مخالف دستے (ATS) نے معصوم بے قصور مسلم نوجوانوں کو پکڑا، ان پر فرد جرم عائد کیا گیا اور اقرار جرم کے لیے ان کو اذیت ناک مراحل سے گذارا گیا، جس کے بعد مقامی عدالت نے ان کو پھانسی کی سزا سنائی ہائی کورٹ نے بھی اس کی توثیق کی ، معاملہ سپریم کورٹ تک گیا، اس پورے واقعہ پر سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں جس انداز سے تبصرہ کیا ہے اسے ٹائمس آف انڈیا نے ۲/ جون ۲۰۱۴ء کی اشاعت میں جگہ دی ہے، اس سے مسلمانانِ ہند کے لیے امید کی آخری کرن نظر آتی ہے کہ ہمارے ملک کی عدالتوں میں اب بھی انصاف پسند برادران وطن موجود ہیں جو عدل وانصاف کے پیمانوں سے کسی بھی مصالحت کے لیے تیار نہیں ہیں، یاد رہے کہ یہ فیصلہ جس دن سنایا گیا اسی دن ملک میں بھگوا جماعت کی فتح کا اعلان ہوا تھا، سپریم کورٹ نے فیصلے میں کسی کو نہیں بخشا بلکہ ذیلی عدالتوں کو یہ کہتے ہوئے لتاڑا کہ اقبالیہ بیانات میں جس طرح کے تضادات موجود ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال جرم رضا کارانہ نہیں تھا، پولیس اور استغاثہ کی خامیوں پر انگلی اٹھاتے ہوئے عدالت نے سوال اٹھایا کہ ونجارا کو پوٹا کی خصوصی عدالت سمیت ذیلی عدالتوں میں گواہ کی حیثیت سے جرح کے لیے کیوں نہیں پیش کیا گیا جس نے کیس حل کرنے میں غیر معمولی تیزی دکھائی، اس طرح نیشنل سیکوریٹی گارڈ کے بریگیڈیئر راج سیتاپتی کا بیان کیوں نہیں ریکارڈ کیا گیا جس کی موجودگی میں پولیس نے فدائین کی پتلونوں سے اردو خطوط برآمد کئے جن میں فسادات کا بدلہ لینے کے لیے اکسایا گیا تھا، تعجب کی بات یہ ہے کہ خون آلود پتلونوں سے حاصل کئے گئے خطوط بے حد اچھی حالت میں تھے، کہیں سے تڑے مڑے یا پھٹے ہوئے تھے نہ ہی ان پر خون کا داغ یا نشان تھا، سپریم کورٹ نے یہ بھی کہا کہ کیس ذیلی عدالت میں ہی دم توڑ دیتا اگر اس وقت کے وزیر داخلہ دماغ کا استعمال کرتے ہوئے پوٹا نہ لگاتے ، یہ ایک غلط اور حکومت کی بدنیتی پر مبنی فیصلہ تھا۔

سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ اس ملک میں گئے گذرے ان حالات میں بھی مسلمانوں کے لیے امید کی شمعیں جلائے ہوئے ہے کہ انصاف کی قدریں کمزور ضرور ہوئی ہیں، ختم نہیں ہوئی ہیں، عدل کی شمعیں ٹمٹمارہی ہیں، بجھی نہیں ہیں۔

☆☆☆

مدارس اسلامیہ

قصۂ دُرد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

مکاتب ومدارس کا مقام ومرتبہ اور ان کے سرکاری امداد قبول نہ کرنے کی اصل وجہ

مولانا ندیم احمد انصاری.....(ڈائریکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن، انڈیا و مہتمم مدرسہ نور محمدی، ممبئی)

پڑھنے لکھنے کی جگہ کو ''مدرسہ'' کہتے ہیں۔ ایران و ہند و پاکستان میں عموماً بچوں کے ابتدائی حروفِ تہجی سیکھنے اور پڑھنے کی جگہ کو 'مکتب' اور دینی رسائل اور بالغوں کے پڑھنے کی جگہ کو 'مدرسہ' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایام جاہلیت میں بھی سرزمین عرب میں اسلام سے پہلے بھی لکھنے پڑھنے کا کچھ رواج تھا اور اسلام کا تو آغاز ہی ''تعلیم'' (اقـــرأ - پڑھو) سے ہوا۔ رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتدا ان آیات سے ہوئی: ﴿اِقْـرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَـلَـق ہ اِقْـرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْـرَم ہ الَّـذِیْ عَـلَّمَ بِالْقَلَمِ ہ عَلَّمَ الْاِنْسَـانَ مَـالَمْ یَعْلَم ہ (سورۃ العلق : ۵-۱)﴾ (ترجمہ) پڑھو، اپنے پروردگار کا نام لے کر، جس نے سب کچھ پیدا کیا۔ اُس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے۔ پڑھو، اور تمھارا پروردگار سب سے زیادہ کرم کرنے والا ہے۔ جس نے قلم سے تعلیم دی۔ انسان کو اُس بات کی تعلیم دی، جو وہ نہیں جانتا تھا۔ (توضیح القرآن : ۱۹۴۲)

رسول اللہ ﷺ کے حکم سے صحابہ کرامؓ میں سے متعدد اشخاص وحی کی کتابت کے فرائض انجام دیتے تھے، جن کی مجموعی تعداد چالیس سے متجاوز ہے۔ وہ ایک دوسرے کی مدد سے آیاتِ قرآنی پڑھنے اور یاد کرنے لگے۔ عقبہ ثانیہ کی بیعت کے بعد ہجرت سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو مدینہ منورہ بھیجا تا کہ وہ ایمان لانے والوں کو قرآن مجید کی آیتیں یاد کرائیں اور نماز کے طریقے وغیرہ کی تعلیم دیں۔ ہجرت کے بعد خود حضرت نبی کریم ﷺ اور سربرآوردہ صحابہ کرامؓ قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے۔ غزوۂ بدر کے بعض قیدیوں کو مسلمانوں کے دس دس لڑکوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کے عوض آزاد کر دیا گیا۔ بعد میں مسجدِ نبویؐ کے چبوترے پر تقریباً ستر صحابہ کرامؓ (جنھیں اصحابِ صفہ) کہتے ہیں، جمع ہو گیے، جو اپنے اوقات قرآن مجید حفظ کرنے، دین کی باتیں سیکھنے اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں صَرف کرتے تھے۔ یہ طریقہ صدیوں سے گزرتا ہوا آج تک کم و بیش ہر مسلم ملک میں رائج ہے۔

مدینہ منورہ میں، مسجدِ نبویؐ، عبادت کرنے، قرآن مجید پڑھنے اور مسائل سیکھنے کی جگہ تھی۔ اس طرح ہر شہر میں مسجدیں، درس گاہیں بن گئیں۔ رفتہ رفتہ مشہور صحابہ کرامؓ کے مکان اور اہلِ علم کے مسکن بھی مدرسے بن گیے۔ حضرت نبی کریم ﷺ سے مسجد کے اندر بھی مسائل پوچھے جاتے تھے اور مسجد کے باہر بھی۔ آپ ﷺ حلقے میں بیٹھ کر بھی مسائل کی تعلیم دیتے تھے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے لیے قبائل میں قراء بھیجے جاتے تھے

۔صحابہ کرامؓ کی سکونت کے ساتھ ساتھ علم کے مرکز بھی مختلف شہروں میں قایم ہوگیے اوروہاں قال اللّٰہ و قال الرسول کے نغمے سامعہ نواز ہونے لگے۔ مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے علاوہ کوفہ، دمشق، قسطاط وغیرہ علمی مرکز بن گیے۔

حضرت علیؓ اور بعض دیگر فقہاءِ صحابہؓ؛ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعری جیسے دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی موجودگی سے کوفہ، مدینہ منورہ کے بعد نہایت اہم علمی مرکز بن گیا۔ یہاں کی درس گاہ میں امام ابوحنیفہؒ اور ان کے مصاحبینؒ کے ہاتھوں احکامِ شرعیہ کی تدوین کا اہم کام انجام پایا۔(دائرۃ المعارف الاسلامیۃ : ۲۰ / ۱۵۶-۱۵٤ ، ملخصاً به ترمیم)

اس طرح یہ ایک طویل سلسلہ ہے، جو آج تک جاری ہے اور دنیا بھر میں دینی مدارس کا گویا ایک جال پھیلا ہوا ہے، جو باطل طاقتوں کا سامنا کرنے کے لیے ایسے سپوت تیار کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، جو دین واسلام کی خاطر اپنی زندگیاں صَرف کردیں۔ پھر بھی آئے دن مدارس اور اربابِ مدارس پر اعتراضات کیے جاتے ہیں، کبھی تعلیم وتدریس کی لائن سے تو کبھی نظم ونسق کی لائن سے۔ حیرت ان لوگوں پر نہیں جو ایسے اداروں سے دور بیٹھ کر اپنی رائے عالی کا اظہار کرتے ہیں، جن کو کبھی ان مدارس اور اہلِ مدارس کی شرفِ صحبت سے مشرف ہونے کا موقعہ نہیں ملا، بلکہ حیرت ان لوگوں پر ہے، جنھیں کبھی نہ کبھی، اور کہیں نہ کہیں انھیں سے اکتسابِ فیض کی برکت نے بلندی وپرواز عطا کی ہے۔

مدارس پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، منجملہ ان کے ایک بہت مشہور اعتراض یہ ہے کہ یہ حضرات سرکاری امداد کیوں قبول نہیں کرتے؟ اور کیوں در در چندے کے لیے پھرتے رہتے ہیں؟ یہ اعتراض کرنے والے عموماً اس کا جواب بھی خود ہی عنایت فرماتے ہیں کہ ''مدارس والے سرکار کو حساب دینے سے ڈرتے ہیں''۔ یہ جواب جتنا سہل ہے اتنا ہی بعید از حقیقت بھی۔ ہمارے اکابرین کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک بڑے مدرسے کا مہتمم اپنے دفتر میں دو مختلف قلم استعمال کرتا ہے، ایک مدرسہ کے کاموں کے لیے اور دوسرا ذاتی کاموں کے لیے، اس لیے کہ مدرسہ کا دیا ہوا قلم ذاتی کاموں میں استعمال کرنا جائز ودرست نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ برصغیر میں رہنے والوں کو مدارس کی کثرت کی بنا پر ان کی اہمیت وافادیت کا احساس کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے۔ ان مدارس کی قدر یوروپ میں رہنے والے مسلمانوں سے پوچھیے، جنھیں قرآن کریم کا ٹھیک تلفظ سکھانے والا کوئی معلم نہیں ملتا اور جہاں معیاری اسلامی تعلیم کے ادارے اور ان کے چلانے کے لیے افراد ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ برصغیر ہی سے آئے دن ان یورپی ممالک کے مسلمان اپنی اسلامی تعلیمی اداروں اور مساجد کے لیے علماء طلب کرتے ہیں۔ نیز یورپ میں دین کی طرف بڑھتے رجحان کی وجہ سے اس مانگ میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ والحمد للّٰہ علی ذلك۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دینی مدارس ''اپنی تمام تر خامیوں'' کے باوجود دین کے جزیرے اور اسلام کے مضبوط قلعے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی تعلیم کی نشو ونما پانے والے اور کالج ویونیورسٹی کی فضا میں پلنے بڑھنے والے مفکر، شاعرِ مشرق علامہ سر محمد اقبالؒ، حکیم شجاع کے نام خط میں ''دینی مدارس کی اہمیت'' کے متعلق مرقوم ہے: ''ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو۔

غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھیں مدارس میں پڑھنے دو۔ اگر یہ مُلّا اور درویش نہ رہے، تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا، میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندوستانی مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہوگئے تو بالکل اسی طرح ہوگا، جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرات اور الحمراء کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نام ونشان نہیں ملے گا۔(دینی مدارس: ٦٩-٦٨) اس لیے کہ یہ مدارس ہی ملک کو پرامن، انسان دوست اور پابند قانون شہری عطا کرتے ہیں، اور جو لوگ مدارس کی بے سروسامانی پر مزاح کرتے ہیں وہ جان لیں کہ باوجود گو نا گو حالات کے ان دینی مدارس کے فضلاء کے متعلق شاید ہی کبھی یہ بات سننے اور دیکھنے میں آئی ہو کہ فلاں بے روزگار عالم ڈاکہ ڈالتے ہوئے اور چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے اور فلاں حافظ صاحب نے بے روزگاری سے تنگ آکر خودکشی کرلی۔ جب کہ دیگر ''تعلیم یافتہ حضرات'' کے ساتھ اس قسم کے حادثات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ایک ہی سماج میں بسنے والے دیگر اور انسانوں، بالفاظِ دیگر ایک ہی طرح کی ضرورت رکھنے والے دو دو شخصوں کے درمیان یہ فرق کیوں ہے؟ یقیناً یہ ان درس گاہوں کی تربیت وتعلیم کے مذاق کا ہی فرق ہے۔(دینی وعصری درس گاھیں: ١١٥)

مفکر اسلام اور نامور مؤرخ وادیب حضرت مولانا علی میاں ندویؒ فرماتے ہیں کہ ''میں مدرسہ کو پڑھنے پڑھانے اور پڑھا لکھا انسان بنانے کا کارخانہ نہیں سمجھتا، میں مدرسہ کی اس حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں، میں اس سطح پر آنے کو تیار نہیں ہوں کہ مدرسہ اس طریقہ سے پڑھنا لکھنا سکھانے یا یوں کہنا چاہیے کہ پڑھنے لکھنے کا ہنر سکھانے کا ایک مرکز ہے، جیسے کہ دوسرے اسکول اور کالج ہیں۔ مدرسہ کا کام ایسا پڑھا لکھا انسان بنانا؛ جو اپنی چرب زبانی سے لوگوں کو مسحور کرلے.....نہیں ہے، مدرسہ کا کام قرآن سنانا ہے، جب کہ دنیا میں ہر حقیقت کا انکار کیا جارہا ہو، اور یہ کہا جارہا ہو کہ سوائے طاقت کے کوئی حقیقت ہے ہی نہیں، جب دنیا میں لامحالہ ڈنکے کی چوٹ پر کہا جارہا ہو کہ دنیا میں ایک حقیقت زندہ ہے، اور سب حقیقتیں مرچکیں، خودداری مرچکی، انسانیت مرچکی، صرف ایک حقیقت باقی ہے اور وہ نفع اٹھانا اور اپنا کام نکالنا ہے۔ اور ہر قیمت پر عزت بیچ کر، شرافت بیچ کر، ضمیر بیچ کر، اصول بیچ کر، خودداری بیچ کر صرف چڑھتے سورج کا پجاری بننا ہی کارآمد ہے، ایسے وقت میں مدرسہ اٹھتا ہے، اور اعلان کرتا ہے کہ انسانیت مری نہیں ہے، اس وقت مدرسہ اعلان کرتا ہے کہ نقصان میں نفع ہے، ہارجانے میں جیت ہے، بھوک میں وہ لذت ہے جو کھانے میں نہیں۔ اس وقت مدرسہ یہ اعلان کرتا ہے کہ ذلت بعض مرتبہ وہ عزت ہے جو بڑی بڑی عزتوں میں نہیں، اس وقت مدرسہ اعلان کرتا ہے کہ سب سے بڑی طاقت خدا کی طاقت ہے، سب سے بڑی صداقت حق کی صداقت ہے، یہ ہے مدرسہ کا کام۔''

(ماخوذ از پا جا سراغِ زندگی: ١٩٢-١٩٠)

یہی وجہ ہے کہ مدارس اور اہلِ مدارس غیر اسلامی سرکار سے امداد قبول نہیں کرتے، مسئلہ یہ نہیں کہ وہ حساب دینے سے ڈرتے ہیں،.....(**بقیہ صفحہ نمبر ۱۰ پر**)

(**بقیہ ص ۱۱کا ''شادی کی چند......''**)

......یہ خدا کا بے لاگ قانون ہے، آج ہماری زندگیوں میں ''نعوذ باللہ'' خدا کے قانون سے کھلم کھلا بغاوت کا اظہار ہی نہیں بلکہ اعلان ہو رہا ہے، اور ہماری زندگیوں سے خدا کی ناراضگی اور اس کے عذاب کو دعوت دینے والے ایسے اعمال سرزد ہو رہے ہیں کہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں خدا کی پکڑ نہ آجائے،

دولت مندوں سے ایک گزارش

صحابہ کرام میں بھی بہت سے صحابہ بہت مالدار اور دولتمند تھے، خود حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جنکی شادی کا نمونہ گزشتہ اوراق میں آپ نے پڑھا ہے ان کی دولت کا حال یہ تھا کہ کئی کئی اونٹوں پر ان کا مال تجارت بار ہوکر روانہ ہوتا تھا، اور حضرت عثمان ذی النورینؓ، جنکا لقب ہی ''غنی'' مالدار تھا، لیکن انھوں نے کبھی اپنی دولت کی نمائش نہ کی، بلکہ ان صحابہ کرامؓ کی پوری دولت راہِ خدا میں خرچ ہوتی تھی، لہٰذا دولت مند ہونا کوئی عیب کی بات نہیں ہے بلکہ اپنی دولت کو غلط طریقہ سے خرچ کرنا، اس کی نمائش کرنا اور اس پر فخر کرنا، اسراف وفضول خرچی یہ سب چیزیں بہت ناپسندیدہ اور اللہ کو ناراض کرنے والی ہیں، اگر اللہ نے آپ کو دولت دی ہے تو اسکو دینی کاموں میں، کمزوروں، مسکینوں، یتیموں، بیواؤں اور بے سہارا وکمزور لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں خرچ کیجئے، جس سے اللہ بھی راضی ہوگا اور آپ کے مال میں بھی برکت ہوگی،

اللہ تعالیٰ پوری امت کو سنت کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ ☆☆☆

(**بقیہ ص ۲۳کا ''کیا اب بھی موجودہ......''**)

......گلوبل وارمنگ، اوزون کا سوراخ، کاربن ڈائی آکسائیڈ کے زہر میں دن دونی رات چوگنی اضافہ، فضا کی آلودگی، صاف پانی کی شدید قلت وغیرہ۔

ان تینوں رشتوں کے بحران نے ہی مزید تین انسانی رشتوں کے توازن کو بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ میری مراد:۔

(۱) مرد کا مرد سے (۲) مرد کا عورت سے اور (۳) فرد کا اپنی ذات سے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنہ سکا

ان رشتوں کے بحران کی وجہ ظاہر ہے مغرب نے زندگی کی روحانی تعبیر کی جگہ مادی تعبیر کو ترجیح دی جس کے نتیجے میں انسان کو پہلے حیوان ناطق ثابت کیا گیا۔اس کے بعد حیوان مطلق، پھر ایک نامیہ(Organism) اور فرد کو اس کا ایک خلیہ(Cell) قرار دے دیا گیا۔ یوں مغرب نے اٹھارہویں صدی میں مذہب کی موت کا اعلان کیا تو انیسویں صدی میں ادب کے جاں بحق ہونے کی اطلاع دی گئی اور بیسویں صدی میں انسان اور اسکی انسانیت کو خیر باد کا مژدہ سنا دیا۔ بالآخر ٹی، ایس، ایلیٹ جیسے ادیب وشاعر اور دانشور نے تسلیم کیا کہ:

''ہوشمندی کے انقطاع کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوگیا جس کی ہم کبھی اصلاح نہ کرسکے''۔

اور روزموں تو چیخ پڑا کہ:

''وحشت وبربریت کامیاب ہوگئی ہے اور ہماری فطرت کے درندہ صفت عناصر نے اپنا نقطۂ نظر ہم سے منوالیا ہے''۔

کیا اب بھی اس ''معلومات زدہ جہل مرکب'' کو پھر اس اولین قرآنی آیت کریمہ سے جوڑنے کا وقت نہیں آیا ہے:۔

''اقرا باسم ربک الذی خلق . خلق الانسان من علق. اقرأ وربک الاکرم. الذی علم بالقلم. علم الانسان مالم یعلم.

''ترجمہ: پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا''۔

تاخیر کا موقع نہ تذبذب کا عمل ہے
یہ وقت عمل، وقت عمل، وقت عمل ہے
☆☆☆

تذکیر

دنیا کی حقیقت: قرآن کی نظر میں

محمد فرمان ندوی، استاذ: دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

یہ عالم رنگ وبو دنیا کے نام سے متعارف ہے، اللہ رب العزت نے اس کو میدان عمل بنایا ہے، اس میں انسان کو خیر وشر کا اختیا دیا گیا ہے، مزید برآں اس کو قوت تمییز بھی عطا گئی ہے، تا کہ وہ آخرت کے لئے ذخیرہ چھوڑ سکے، جو کہ آخری منزل اور جائے مراد ہے، دنیا کے معنی قریب ترین شئی کے ہیں، آخرت کی بنسبت یہ انسان کے ساتھ ہے، اس لئے اس کو دنیا کہا گیا ہے، قرآن میں دنیا کا لفظ ۱۱۵/ مرتبہ آیا ہے، قرآن کا عددی اعجاز ہے کہ آخر ت کا ذکر بھی ۱۱۵/ بار آیا ہے، دنیا کا تعارف قرآن میں اس طرح آیا ہے: دھوکہ کا سودا، لہو ولعب کی جگہ، امتحان کی جگہ، مصائب کا گھر، مسافرت کی منزل، عبادت وعمل کا مقام وغیرہ۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دنیوی زندگی کے دو پہلو ہیں: مثبت اور منفی، مثبت کے سلسلہ میں قرآن گیا ہے: ولاتنس نصیبك من الدنیا یعنی دنیا کے اندر اپنے حصے کو فراموش نہ کرو، اور ارشاد باری ہے: ربنا آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة ، وقنا عذاب النار ۔اے اللہ! دنیوی زندگی میں ہمیں بہتری عطا فرما، اور اخروی میں بھی، اور جہنم کے آگ سے ہم کو محفوظ فرما۔ دنیا کی بہتری کا مطلب یہی ہے کہ انسان کو اللہ کی مرضیات کے مطابق زندگی گزارنے کی توفیق مل جائے۔

منفی پہلو یہ ہے کہ یہ دھوکہ کا سودا ہے، چنانچہ انسان اس کے اندر مسافرانہ زندگی گذارے اور اس کو قید خانہ سمجھے ، کیونکہ ارشاد باری ہے: دنیا کی زندگی لہو ولعب ، زیب وزینت اور فخر ومباہات سے عبارت ہے، انسان اپنے بچپن میں کھیل کود میں مگن رہتا ہے، اس کی جوانی تراش وخراش میں گذرتی ہے ، اور بڑھاپے میں اس کے اندر فخر کے جذبات امنڈتے ہیں پھر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا کی اصل حقیقت ہے، ایک حدیث میں دنیا کی تشبیہ ایک کالی کلوٹی ، بدصورت عورت سے آئی ہے کہ جس طرح وہ عورت انسان کی نگاہ میں خوش منظر نہیں ہوتی ہے اسی طرح دنیا کی محبت اس کے اندرون میں جاگزیں نہیں ہونا چاہئے۔

دنیا کی بے ثباتی کا اندازہ اس تمثیل سے بخوبی ہوتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے: ان کے سامنے دنیا کی مثال بیان کرو، جیسے پانی، جسے ہم آسمان سے اتارتے ہیں، اس سے

زمین کا سبزہ ملا جلا نکلا ہے، پھر وہ آخر کار چورا چورا ہو جاتا ہے، جسے ہوائیں اڑائے لئے پھرتی ہیں، اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے ۔ یہ مثال سورہ یونس (۲۵) سورہ زمر (۲۱) ،اور سورہ حدید (۵۰) وغیرہ میں بھی وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا: میری مثال دنیا کے اندر اس سوار کی سی ہے جو کسی سایہ میں تھوڑی دیر دم لے اور چلتا بنے، کسی اللہ والے نے کہا ہے:

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے، تماشہ نہیں ہے

آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، سورہ نساء (۷۷) میں فرمایا گیا: دنیا کا سودا بہت معمولی ہے، اور آخرت ہی متقیوں کے لئے بہترین سوغات ہے، لیکن مقام افسوس ہے کہ لوگ اس کھوٹی پونجی کے حصول کے لئے سرگرداں نظر آتے ہیں، چنانچہ سورہ بقرہ (۲۰۱) میں فرمایا گیا ہے: کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! دنیا کی زندگی میں ہم کو خیر کثیر عنایت فرما، ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں کچھ بھی نہیں ہے، اور کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے میرے پروردگار! دنیا کی زندگی میں بھی ہم کو نعمتوں سے سرفراز فرما اور آخرت میں بھی، اور جہنم کی آگ سے محفوظ فرما، ایسے ہی لوگوں کے لئے آخرت میں انعام ہے یعنی انکے اعمال کا حصہ ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے،

دنیا دار مادہ پرست ہوتا ہے، اس کو صرف اپنے پیٹ کی فکر دامن گیر رہتی ہے، اس کا اعلان ہوتا ہے کہ روٹی، کپڑا، مکان ہی ہمارا سرمایہ حیات ہے، وہ ناؤ نوش کا پجاری ہوتا ہے، چنانچہ وہ دنیا کے پیچھے چلتا ہے، اور دنیا اس سے دور رہتی ہے، جبکہ خدا پرست انسان وحدانیت کا قائل ہوتا ہے، اس کا اندرون ذکر الٰہی سے روشن ہوتا ہے، وہ معدہ کا غلام نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا بندہ اور اس کے حکم کے سامنے سرافگندہ ہوتا ہے، ایسے ہی کے قدموں میں دنیا آکر اپنی پیشانی رگڑتی ہے اور ذلیل وخوار ہوتی ہے، انہی دو نظریات کے حاملین کا تذکرہ سورۂ کہف کی آیت ۳۲ تا ۳۹ میں آیا ہے: دو باغ والے تھے، دونوں بڑے خوش نصیب تھے، اللہ نے ان کو کھجور اور انگور کے باغات کے علاوہ قابل کاشت زمین بھی تھی ، ایک مرتبہ اپنے دوست (جو خدا شناس تھا) سے مارے فخر کے کہتا ہے کہ دیکھو میں تم سے زیادہ مالدار ہوں، پھر وہ اپنے باغ میں دولت کے نشہ میں چور ہو کر داخل ہوا، اور ڈینگیں مارنے لگا، اس کو اس کے دوست نے سمجھایا لیکن اس نے اسکی کچھ بھی نہ سنی۔ جب کہ اس کے دوست نے اللہ کی دی ہوئی نعمت پر تشکر کے کلمات کہے ۔ یہ مثال ہے ایک خدا پرست اور مادہ پرست انسان کی۔ خلیفۂ رابع حضرت علی رضی اللہ عنہ دنیا کی حقیقت سے واقف تھے، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ اے دنیا! کیا تو میرے پیچھے پڑی ہے، چل ہٹ، کسی اور کو دھوکہ دینا، مجھے معلوم ہے کہ تیری عمر بہت مختصر ہے۔ اور تیرے مسائل بیشمار ہیں۔

☆☆☆

اصلاح معاشرہ

شادیوں کی چند رسوم وخرافات

محمد شعیب ندوی، پرتاپ گڑھ

اسلام دینِ کامل ہے، اس میں کوئی نقص نہیں ہے، قیامت تک جتنے انسانی مسائل پیش آنے والے ہیں اور جن جن معاملات سے واسطہ پڑنا ہے، ان کا سب سے بہترین اور معتدل حل صرف اور صرف مذہبِ اسلام میں موجود ہے، اور علماء کرام نے اپنے اپنے زمانوں میں زمانہ کے حالات کے اعتبار سے قرآن وحدیث اور فقہاءِ امت کے اجتہادات کی روشنی میں اس کا حل پیش کیا ہے، اور شریعت کی تعلیمات ایسی واضح اور روشن وتابناک ہیں کہ اس میں کسی طرح کی پیچیدگی اور ابہام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ﴿لقد ترکتکم علیٰ مثل البیضاء لیلها و نهارها سواء﴾ ''میں نے تم کو بالکل روشن اور چمکدار راستہ پر چھوڑا ہے، جس کی رات بھی اس کے دن کی طرح چمکدار ہے'' (سنن ابن ماجہ باب اتباع سنة رسول اللہ ﷺ) اور اللہ نے فرمایا ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيناً﴾ (المائدۃ ۳)

''آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے بطور دین ومذہب کے مذہب اسلام کو پسند کیا''

اب اگر کوئی مسلمان ہوتے ہوئے اسلامی تعلیمات سے ہٹ کر دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے، یا غیروں کے رسوم ورواج کو اختیار کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اسلامی تعلیمات پر اطمینان نہیں یا خدا کا پسندیدہ مذہب اسے قبول نہیں ہے، اور جسے اسلامی نظام اور طریقۂ محمدی قبول نہ ہو پھر وہ خدا کو بھی قبول نہیں ہے بلکہ وہ مردود ہے، ارشاد ربانی ہے، ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيناً فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾ (آل عمران ۸۵) ''اور جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو تلاش کرے گا تو اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا''

اسی لئے قرآن میں اللہ نے غیروں کی طرف ادنیٰ میلان اور جھکاؤ سے بھی منع فرمایا ہے ﴿وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾ (ھود ۱۱۳)

''اور ظالموں یعنی کفار ومشرکین کی طرف مت جھکو ورنہ آگ تمہیں بھی پکڑ لے گی''

کمال ایمان کا معیار

ایمان کے کامل ہونے کا معیار صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ اور اس کے رسول اور آخرت پر ایمان مضبوط وپختہ ہو بلکہ ایمانی

غیرت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ طاغوت کا انکار بھی پورے زور وقوت سے کیا جائے، ارشاد خداوندی ہے ﴿ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ﴾ (البقرة ٢٥٦)

''تو جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، تو اس نے مضبوط حلقہ پکڑ لیا''

اس آیت میں ''یکفر بالطاغوت'' کو ''یومن باللّٰہ'' سے پہلے لانے کا راز ہی یہی ہے کہ طاغوت سے انکار کی اہمیت اہلِ ایمان پر واضح ہو جائے، اور طاغوت کا مطلب تمام شیطانی طاقتیں اور کفر وشرک کے تمام مظاہر خواہ کسی شکل میں رونما ہوں ان کا انکار اور ان سے برأت کا اظہار اہل ایمان پر لازم ہے، چنانچہ اس وقت مسلمانوں میں غیروں کے ساتھ ہمسائیگی کی وجہ سے غیروں کے بہت سے طریقے اور ان کی رسمیں اس طرح داخل ہوگئیں ہیں کہ مسلمانوں میں ان کے غیر اسلامی اور گناہ ہونے کا احساس ہی ختم ہوگیا ہے، جو بڑے خطرہ کی بات ہے، خاص طور پر شادیوں کے موقع پر اکثر کام غیر اسلامی ہی ہوتے ہیں، اور اسلام تو صرف خال خال ہی نظر آتا ہے، جو آئے دن ہم لوگوں کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے، افسوس اس بات کا ہے کہ آج اسلام کو ہم نے مسجدوں اور ایسی ہی چند جگہوں میں قید کر دیا ہے، خود اس کے تابع اور فرمانبردار ہونے کے بجائے خود اسلام ہی کو اپنی خواہشات کے تابع بنالیا ہے، کہ ہم جب اور جہاں چاہیں گے اسلام کو چلنے اور اپنا اثر دکھانے کا موقع دیں گے اور جہاں چاہیں گے اس کو روک دیں گے کہ ابھی تمہاری ضرورت نہیں، یہ اسلام نہیں کفر ہے، یہ طاعت وبندگی نہیں بلکہ بغاوت وسرکشی ہے۔

اس وقت یہاں چند غیر اسلامی رسموں کا تذکرہ کیا جارہا ہے، حالانکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں نکاح کے موقع پر جو چیزیں مسنون ہیں اس کے علاوہ تمام چیزیں غیر اسلامی ہیں، لیکن بعض رسمیں ہمارے معاشرہ میں ایسی جڑ پکڑ چکی ہیں اور اس طرح رائج اور عام ہو چکی ہیں کہ کھلے عام اس کے خلاف کہنے اور سننے کی ضرورت ہے،

منگنی

آج ہمارے دور میں جب نکاح کی بات شروع ہوتی ہے تو لڑکی کو دیکھنے کے لئے لڑکے والوں کی طرف سے عورتیں اس کے گھر جاتی ہیں اور اپنے ساتھ زیورات اور کئی جوڑے بھی لیکر جاتی ہیں، اور لڑکی کو پہناتی ہیں اور کچھ نقدی بھی دیتی ہیں، یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یہ رشتہ پسند ہے، اس کے بعد لڑکی والے ضروری سمجھتے ہیں کہ جتنی عورتیں گئی ہیں ان میں سے ہر ایک کو جوڑے اور نقد روپئے بھی دئے جائیں، بعض جگہوں پر اسی موقع پر جہیز کا لین دین بھی طے ہوتا ہے، یہ نہایت بری اور قبیح رسم ہے، جسکا شریعت وسنت سے کوئی تعلق نہیں ہے،

بارات

لڑکی والوں کے مطالبہ پر یا بغیر مطالبہ کے لڑکے والوں کا خود بارات لیکر جانا بھی شرعاً ناجائز ہے، کیونکہ قرآن وحدیث کے ذخیرہ میں کہیں اس کا کوئی ذکر اور ثبوت نہیں ملتا ہے بلکہ یہ بھی وہی غیروں کی تقلید اور پیروی کا ایک منحوس حصہ ہے، جس کو ہم نے شادی کا ایک اہم جزء سمجھ لیا ہے، اور چونکہ بارات میں

ایک نہایت غلط کام یہ ہوتا ہے کہ جتنے لوگوں کو بلایا جاتا ہے اس سے کچھ نہ کچھ زائد بلکہ بسا اوقات اس کے دوگنے لوگ جاتے ہیں جو سراسر جبر واکراہ اور ظلم ہے، کسی دعوت میں بغیر دعوت کے جانے والا ایسا ہے جیسا کہ حضورﷺ نے ارشاد فرمایا ''چور کی طرح گیا اور ڈاکو کی طرح واپس آیا'' (مشکوٰۃ ۲۸۷) اور حضورﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿ألا لا تظلموا ،ألا لا یحلّ مال امرئ الا بطیب منه﴾ (مشکوۃ/۲۵۵) ''غور سے سن لو کہ کسی پر ظلم نہ کرنا اور سن لو کہ کسی انسان کا مال بغیر اسکی خوش دلی اور رضامندی کے جائز نہیں ہے''

لہٰذا اگر بارات میں ایک شخص بھی زیادہ گیا تو اسکا جانا اور کھانا حرام ہے، اب آپ فیصلہ کیجئے کہ کس کو فرد زائد قرار دیں گے، اور اگر لڑکی والے بخوشی اجازت دیں تو چونکہ یہ ماحول اور سوسائٹی کے دباؤ کا اثر ہوتا ہے اور خلافِ شریعت ہونے کی وجہ سے ناجائز ہی کہنا پڑے گا اور پھر اس ایک غلط کام کے نتیجہ میں کتنے گناہ اور بیہودگی اور بسا اوقات انسانیت سوز کام ہوتے ہیں کہ اللہ کی پناہ، اور کبھی کبھی باراتی ایسا اودھم مچاتے ہیں اور ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور ننگا ناچ ناچتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، کہ یہ انسان ہیں یا جانور اور درندے، جنکو انسانیت سے کبھی واسطہ نہیں پڑا،

اور اس کے غلط ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خرچ کا بار اسلام نے شوہر پر رکھا ہے لڑکی والوں پر نہیں، لیکن ہم سارا بوجھ لڑکی والوں پر ڈال کر فخر کرتے ہیں جو انتہائی بے غیرتی کی بات ہے، اسی کے ساتھ اس میں جو فضول خرچی اور نام ونمود کا جذبہ، شیخی بگھارنے اور فخر ومباہات کا اظہار ہوتا ہے، یہ تمام چیزیں خالق کائنات کو سخت نا پسند اور مبغوض ہیں، اور جن شادیوں میں یہ سب خرافات ہوتی ہیں ان پر خدا کی رحمت کے بجائے خدا کا قہر وغضب اور فرشتوں کی لعنت برستی ہے، اس لئے بارات کے سسٹم کو ختم کیجئے، اور نہایت سادگی کے ساتھ مسجدوں میں نکاح کا ماحول بنایئے، اگر یہ بارات کی رسم ختم ہو جائے تو بہت ساری خرافات خود بخود ختم ہو جائیں گی،

منھ دکھائی

یہ ایک انتہائی خطرناک اور قابلِ لعنت گناہ ہے، منھ دکھائی میں کیا ہوتا ہے؟ جب بارات رخصت ہونے کا وقت قریب ہوتا ہے تو لڑکی والے جہیز کو نمائش کیلئے باہر رکھ دیتے ہیں، اور وہاں دولہا بھی موجود ہوتا ہے، اس وقت جہیز اور دولہا کو دیکھنے کیلئے مردوں کے ساتھ عورتوں کا ہجوم ہوتا ہے جس میں مردوں اور عورتوں کا اختلاط بھی ہوتا ہے، اور سب ایک دوسرے کو بے باکی کے ساتھ دیکھتے ہیں، ایک طرف اجنبی مردوں اور نہ معلوم کیسے کیسے لوگوں کی کیسی کیسی نگاہیں، اور دوسری طرف گھر کی بہن بیٹیاں، اعزہ واقارب کی لڑکیاں ہوتی ہیں، اور اس وقت شرم وحیا اور پردہ کو بھی بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے، اور نہ معلوم گھر کے مردوں کی غیرت وحمیت اور ان کی عقل وخرد اس وقت کہاں چلی جاتی ہے، اور نہیں سمجھ پاتے کہ یہ کیسے کیسے لوگ اور کیسی کیسی ناپاک اور گندی وغلط نگاہوں سے ان کے گھر کی عورتوں پر نگاہ ڈالی جارہی ہے، بلکہ ان کو اسکا احساس بھی نہیں ہوتا ہے جبکہ کسی اجنبی عورت کو دیکھنا حرام ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

﴿ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ﴾

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ﴾(نور ۳۰۔۳۱)

''اے نبی! مومنو سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اوراپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں،اورمومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں''

حضورﷺ نے ارشادفرمایا﴿النظرسھم من سھام الشیطان﴾

''نگاہ شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر ہے''

لہٰذا یہ خبیث وملعون رسم حرام ہے اس سے توبہ کرنی چاہئے ،اور شریعت کا حکم تو اپنی جگہ پر،لیکن جس کے گھر پر یہ کام ہوتو سمجھنا چاہئے کہ وہ حد درجہ کا بے غیرت اورنہایت بے حیاانسان ہے جس کواپنی عزت وآبروکی کوئی پرواہ نہیں ہے،اور شیطان بھی اپنے لاؤلشکر کے ساتھ اس محفل پر مسلط ہو کر مارے خوشی کے ناچ رہا ہوتا ہے،اور وہ بھی جشن مناتا ہے، کہ دیکھواس وقت ان لوگوں پرصرف اورصرف ہمارا راج چل رہا ہے۔اوراس وقت حضورﷺ کے احکامات وتعلیمات کی ایسی بے حرمتی اور پامالی ہوتی ہے،اورروحِ نبی کواپنے نام لیواؤں سے ایسی اذیت پہنچتی ہے کہ جن کے دلوں کے اندر ذرہ برابر ایمان ہوان کے لئے خوشی ومسرت کا دن نہیں بلکہ امت کے حال زار پر ماتم کرنے اورخون کے آنسو بہانے کا وقت ہے،

جہیز

یہ بھی انسانی معاشرہ کیلئے ایک ناسور ہے، جو پورے معاشرہ کوگھن کی طرح کھائے جارہاہے،جس کی نحوست سے نہ معلوم کتنی بیٹیاں زندگی سے ہاتھ دھونے پر مجبور ہوچکی ہیں، کتنے والدین خودکشی کرکے حرام موت کی آغوش میں جا چکے، اور کتنی لڑکیاں زنا کاری وبدکاری کی نذر ہوچکیں،اوردوسروں کے ہاتھوں اپنی عزت وآبروکا سودا کرنے پر مجبور ہیں،اور کتنے گھر اجڑ چکے،سودی قرضوں کے نیچے ایسے دب گئے کہ آج تک دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوا،الغرض اس رسم بدکی تباہ کاریاں بے شمار ہیں،اور یہ وبا اتنی عام ہوچکی ہے کہ ہرکس وناکس،کیا ہندو کیا مسلمان سب اسکے مارے ہوئے خون کے آنسو بہا رہے ہیں،لیکن اس سے نجات کی کوئی صورت کسی کو سجھائی نہیں دے رہی ہے،

اوردوسری طرف دولت مندوں کا حال یہ ہے کہ جہیز کے نام پر لاکھوں کروڑوں روپئے پانی کی طرح بہا دینا ان کے لئے معمولی بات ہے،اوروہ یہ نہیں سوچتے کہ اپنی اسی رقم سے قوم کی کچھ مجبوروبےکس،یتیم وبےسہارا بیٹیوں کا سہارا بن کر ان کی شادیاں کروادیں،اوران کے بھی گھر بسانے کا سامان کر دیں ،اوراب تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ باقاعدہ جہیز کا مطالبہ ہوتا ہے اور اسکی فہرست بھیجی جاتی ہے، اور جہیز نہ لانے پر بہوؤں اور بیٹیوں کو جلانے کے واقعات اس کثرت سے پیش آرہے ہیں کہ انکا شمار کرنا مشکل ہے، یہ جہیز کا مطالبہ کرنے اورمطلوبہ جہیز نہ لانے پر زدوکوب کرنے والے یا زندہ جلادینے والے کون ہیں؟ یہ معاشرہ کے سب سے بڑے مجرم، حد درجہ لالچی اورسب سے بڑے بھکاری ہیں، جو یہ نہیں سوچ پاتے کہ جس ماں باپ نے اپنی سب سے قیمتی سوغات،خونِ جگر پلاپلا کر جس کو پالا تھا ایسی لاڈلی اور نازوں میں پلی

اور بڑھی لختِ جگر انکے حوالہ کر دی ،اب اس سے بڑھ کر ان کمینہ فطرت انسانوں کو اور کیا چاہئے ، اللہ نے مرد کو فضیلت اسی لئے دی ہے کہ وہ قوّام ہے، اور اسکی ذمہ داری ہے کہ اپنی بیوی کی پوری کفالت کرے، اور تمام ضرورتیں پوری کرے، اور عورت سے مال و دولت کی آس لگانا اور اسکی دولت پر للچائی ہوئی نظر ڈالنا ایک مرد کی غیرت وحمیت ہی نہیں بلکہ اسکی مردانگی کے خلاف ہے،

لہٰذا اس لعنت کو ہمیں اپنے معاشرہ سے ختم کرنا پڑیگا، آج شادیوں کو مشکل بنانے میں سب سے بڑا ہاتھ اسی رسم جہیز کا ہے، آج جس کے پاس ایک یا دو بیٹیاں ہیں وہ چوبیس گھنٹے انکی شادی کے انتظامات ہی کی فکر میں کھویا رہتا ہے، اور اپنی پوری زندگی کی کمائی اسی میں جھونک دیتا ہے، بلکہ آج لڑکیوں کی پیدائش سے نفرت وکراہت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انکی شادی کے مسئلہ کو اتنا اہم اور پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ بیٹی کے تصور سے ہی آدمی کانپ اٹھتا ہے، اور اسی وجہ سے کتنی لڑکیاں عالمِ وجود میں آنے سے پہلے ہی رحمِ مادر میں درگور کر دی جاتی ہیں، جس کے تعلق سے قرآن نے کیسی دل دہلا دینے والی وعید ارشاد فرمائی ہے، ﴿وَاِذَاالْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ،بِأَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾(تکویر ۸۔۹)''اور جب زندہ درگور کی جانے والی لڑکی سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کی پاداش میں قتل کی گئی تھی''

تو دل پر ذرا ہاتھ رکھ کر بتائیے کہ اس وقت کیا جواب بن پڑے گا؟

وقت کی اہم ضرورت

اس وقت سب سے اہم ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم حضورﷺ کے اسوۂ حسنہ کی تقلید کرتے ہوئے انکے نقشِ قدم پر اپنے معاشرہ کی تشکیل کریں، حضورﷺ نے اپنی بیٹیوں کی جو شادیاں کیں اور خاص طور پر اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے کس سادگی سے کیا، صحابہ کرام اور ان کے بعد تابعین واسلاف کے یہاں شادیوں کا جو طریقہ تھا، ہمیں بھی اسی کو اختیار کرنا چاہئے کہ ہماری فلاح وکامیابی اسی میں ہے، اس کے علاوہ جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے گا اس میں سراسر ناکامی ونامرادی اور ذلت ورسوائی ہے،

دورِ رسالت میں نکاح کے چند نمونے

اس موقع پر اسلامی طریقۂ نکاح کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ اسلام میں نکاح کس قدر سادہ اور سہل ترین چیز ہے، جو بیٹھے بیٹھے اور باتوں باتوں میں ہو جایا کرتا تھا، جس میں نہ کسی تیاری کی ضرورت ہوتی تھی اور نہ کوئی اہتمام، ادھر رشتہ منظور ہوا، ادھر فوراً اسی مجلس میں دو گواہوں کی موجودگی میں نکاح ہو گیا ، نہ منگنی کی رسم ،نہ بارات ،نہ دور ونزدیک کے رشتہ داروں کو جمع کرنا، نہ دعوت نامے چھپوا کر تقسیم کرنا، نہ مسرفانہ ٹھاٹ باٹ۔ اکثر وبیشتر تو پڑوسیوں تک کو خبر نہیں ہوتی تھی کہ فلاں گھر میں نکاح ہوا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے نکاح کا واقعہ

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے تو ان کے کپڑوں پر پیلا نشان تھا، جسے دیکھ کر حضورﷺ نے دریافت فرمایا کہ یہ نشان کیسا ہے؟ اس

پر انھوں نے جواب دیا کہ اے رسولِ خدا ﷺ! میں نے نکاح کرلیا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ ولیمہ کرلینا، خواہ ایک بکری ہی کے ذریعہ ہو۔ (بخاری کتاب النکاح ۱۱۸/۶)

اس حدیث کے ذریعہ ہمارے لئے جو سب سے بڑا سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ نکاح کے موقع پر دور اور نزدیک کے تمام رشتہ داروں اور خاص کر اپنے تمام بزرگوں کو بلانا ضروری نہیں ہے، ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو حضرت عبدالرحمٰنؓ رسول اکرم ﷺ کی شرکت کے بغیر نکاح ہرگز نہ کرتے، مگر آپ ﷺ کی شرکت تو درکنار اسکی اطلاع تک آپ کو دینا ضروری نہیں سمجھا، بلکہ ان کے ہاتھ کی زردی دیکھ کر رسول اللہ ﷺ خود ہی پہچان لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ رسول اکرم ﷺ سے بڑھ کر انکے لئے اور کون بزرگ ہوسکتا تھا، لیکن انھوں نے حصولِ برکت ہی کی نیت سے سہی، رسول اکرم ﷺ کی شرکت ضروری نہیں سمجھی، اس واقعہ سے اس دور کی معاشرت کا حال واضح ہوتا ہے۔ دوسری طرف حضور ﷺ نے کسی ادنیٰ ناراضگی کا بھی اظہار نہیں فرمایا۔

حضرت فاطمہؓ کی شادی

حضرت فاطمہؓ کا پیغام پہلے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف سے آیا، مگر آنحضرت ﷺ نے کم عمری کا عذر فرما دیا، پھر حضرت علیؓ نے خود حاضر ہو کر شرماتے اور جھجکتے ہوئے اپنا پیغام دیا، جسے باذن خداوندی قبول فرما لیا گیا، بس زبانی طور پر سب کچھ طے ہو گیا، نہ لوگ اکٹھا ہوئے، اور نہ کوئی اہتمام ہوا، اس وقت حضرت علیؓ کی عمر ۲۱ سال اور حضرت فاطمہؓ کی ۱۵ سال تھی، اس سے معلوم ہوا کہ دونوں کی عمروں میں زیادہ فرق نہ ہونا چاہئے،

حضور اکرم ﷺ نے اپنے خادم خاص حضرت انسؓ کو حکم دیا کہ جاؤ! ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر اور انصاری صحابہؓ کی ایک جماعت بلا لاؤ، یہ سب لوگ حاضر ہو گئے، آپ ﷺ نے ایک مختصر سا خطبہ دیکر نکاح کر دیا، اور چھوارے تقسیم کرادئے، پھر حضور ﷺ نے ہی حضرت امّ ایمنؓ کے ہمراہ حضرت فاطمہ کو حضرت علیؓ کے گھر بھیج دیا اور گھریلو استعمال کا سامان بھی جس میں دو چادریں کچھ اوڑھنے بچھانے کا مختصر سامان، دو بازو بند، ایک کملی، ایک تکیہ، ایک پیالہ، ایک چکی، ایک مشکیزہ، ایک گھڑا، اور بعض روایتوں میں ایک پلنگ کا تذکرہ بھی ملتا ہے، یہ تھا کل جہیز سرورِ کائنات کی چہیتی صاحبزادی کا، اور اس سامان کا دینا بھی ضرورتاً تھا، نہ کہ رواجاً، کیونکہ حضرت علیؓ کے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں، وہ آنحضرت ﷺ کے زیر سرپرستی اب تک رہے تھے، آپ کے علاوہ کوئی اور ایسا وہاں نہ تھا جو اس قسم کی ضرورتیں پوری کرنے میں مدد کرتا، انھوں نے خود فرمایا تھا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے، مالی من شئی (مسند أحمد ۸۰/۱ بحوالہ معاشرتی مسائل ۴۹۔۵۰)

ایک اعتراض کا جواب

جہاں حضرت فاطمہؓ کے نکاح کا تذکرہ آتا ہے، وہاں ''جہیز'' کا لفظ بھی آتا ہے، جس سے بعض لوگوں کو اس لفظ سے غلط فہمی ہوتی ہے، اور اسی سے وہ جہیز کا ثبوت پیش کرنے لگتے ہیں کہ کسی درجہ میں جہیز کا ثبوت ملتا ہے، مولانا شہاب الدین ندویؒ نے اس اشکال کا جواب دیا ہے، اسی کو یہاں نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں: ''رسول اکرم ﷺ نے

حضرت فاطمہؓ کو جو معمولی چیزیں عنایت کی تھیں، وہ بطور جہیز نہیں بلکہ حضرت علیؓ کی جانب سے ادا کئے گئے مہر معجّل کے ذریعہ خریدی ہوئی چند چیزیں تھیں۔ظاہر ہے کہ یہ جہیز نہیں تھا، کیونکہ یہ مہر معجّل کے پیسوں سے خریدا گیا تھا، لہٰذا اسے جہیز اور وہ بھی فرمائشی جہیز سے کیا نسبت ہوسکتی ہے، اور پھر حضور ﷺ کی چار صاحبزادیاں تھیں، مگر سوائے حضرت فاطمہؓ کے دوسری کسی بھی صاحبزادی کے لئے اس قسم کی چیزیں یا جہیز دینا ثابت نہیں ہے، اور نہ ہی دورِ رسالت یا دورِ صحابہؓ میں اس قسم کے کسی جہیز کا ثبوت ملتا ہے، (اسلام کا قانونِ نکاح ۲۱۰۔۲۱۲)

یہاں پر جن چند رسموں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ عموماً اکثر جگہوں پر پائی جاتی ہیں، اس کے علاوہ علاقہ وشہر اور ماحول ومعاشرہ کے اعتبار سے بے شمار الگ الگ علاقائی رسمیں ہیں جو سراسر غیر اسلامی اور ہندوانہ ہیں، جنکا شمار کرنا بڑا مشکل کام ہے، البتہ جس کے دل میں ایمان اور خوفِ خدا اور آخرت میں باز پرس کا احساس ہے، اس کے لئے یہ چند اشارے ہی کافی ہیں۔

غور کرنے کا مقام

یہ امت مسلمہ آج ترقی کے نشہ میں اپنے دین وشریعت سے اتنی بیگانہ اور اس سے اس قدر دور ہوچکی ہے کہ اسے ہر موڑ پر غیروں کا طریقہ راس آنے لگا ہے، اور پیارے حبیب ﷺ کی سنت سے اس کو بیر ہو چکا ہے۔

مسلمانو! خدا کا یہ دین اور حضور پاک ﷺ کا طریقہ مسلمانوں کے لئے ایسی عظیم نعمت ہیں کہ اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے، جو قومیں اس نعمت سے محروم ہیں ان کا حال دیکھئے اور ان سے پوچھئے کہ وہ کیسی در در کی ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں، اور اپنے طرزِ زندگی سے کس قدر بیزار ہو چکے ہیں، وہ یورپ وامریکہ اور یورپ کے بڑے بڑے ممالک جن کو اپنی ترقی پر بڑا ناز ہے، وہ دم توڑتے نظر آرہے ہیں اور ان کا خاندانی نظام تاش کے پتوں کی طرح بکھر چکا ہے، اور ہماری آپ کی ہم سایہ قومیں (ہندو اور بودھ، سکھ اور عیسائی) جن کی نقالی میں ہم اندھے ہو گئے ہیں ان کا بھی خاندانی نظام بلکہ پورا مذہبی نظام بالکل کھوکھلا ہے، یہ سب قومیں پیاسی ہیں، اور وہ آبِ حیات صرف اور صرف اس مذہبِ اسلام میں ہے، جس کے آپ نمائندہ ہیں، آپ اگر زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کو نمایاں کرنا شروع کردیں اور خالص اسلام کو اختیار کرلیں اور غیروں کی تقلید اور نقالی سے باز آکر سنت وشریعت کے راستہ پر اپنے معاشرہ کی تعمیر کرلیں تو آج بھی ﴿يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجاً﴾ (النصر/۲) کا منظر نظر آنے میں دیر نہیں لگے گی۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ اس وقت اسلام کو سمجھنے کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری غیر اسلامی زندگی بنی ہوئی ہے، جبکہ اللہ نے ہمیں دوسروں کے لئے نمونہ بنا کر پیدا کیا ہے، اور اس دین کی نمائندگی اور اس کی سربلندی کی فکر ہماری سب سے بڑی اور پہلی ذمہ داری ہے، اور اس ذمہ داری سے روگردانی کے نتیجہ میں برابر ہم مصیبتوں میں گرفتار ہیں، غیروں کی نظر سے بھی ہم گر گئے، اور خدا کی نصرت اور اس کی مدد سے بھی محروم ہو گئے، اور خدا کی مدد اور اس کی نصرت اس وقت تک نہیں آئیگی جب تک کہ ہم گناہوں سے توبہ کر کے اور ان غیر اسلامی رواجوں اور طریقوں کو چھوڑ کر اپنے معاشرہ کو اسلامی سانچہ میں نہ ڈھال لیں،..... (**بقیہ ص ۵۲ پر**)

نقطۂ نظر

کیا اب بھی موجودہ نظام تعلیم پر نظر ثانی کا وقت نہیں آیا ہے؟

پروفیسر احمد سجاد

عام خیال یہ ہے کہ عصر حاضر کے تین مہمات مسائل کی صحیح تفہیم اور انکے واقعی حل پر دنیائے انسانیت کی خیر منحصر ہے اور وہ ہیں:

(۱) علمی دھماکہ کے نتیجے میں مادیت کا زور (۲) غربت (۳) قدروں کا بحران

اس میں شک نہیں کہ سائنسی علوم کے بطن سے برآمد شدہ مختلف ٹکنالوجیوں (مائیکرو، بائیو، نیوکلیر ٹکنالوجی وغیرہ) کے ساتھ انفارمیشن ٹکنالوجی نے دنیا میں علمی دھماکہ (Knowledge Explosion) پیدا کر دیا ہے اور روایتی طریقۂ تعلیم کے ساتھ فاصلاتی (Distance) اور آن لائن طریقۂ تعلیم نے واقعتاً دنیا بھر میں ایک خاموش تعلیمی انقلاب برپا کر دیا ہے جس کے نتیجے میں مادی و معاشی خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہو چکا ہے۔ چنانچہ ایک اندازے کے مطابق دنیا میں آج اناج کا اتنا بڑا بھنڈار تیار ہے جس سے موجودہ سات ارب کے بجائے اکیس ارب کی آبادی کا پیٹ بھرا جا سکتا ہے۔ مہلک ترین امراض پر قابو پانے کی ادویات کا ایک ہمالہ پہاڑ تیار ہو چکا ہے، کپڑوں کی کثیر پیداوار سے اس گلوب کو سات بار لپیٹا جا سکتا ہے اور دنیا بھر میں فلک بوس عمارتوں کا ایک جنگل کھڑا ہو چکا ہے۔

ان خوشگوار حقائق کے باوجود تقریباً تمام سروے کے نتائج گواہ ہیں کہ مذکورہ عظیم ترین وسائل کے باوجود آج بھی دنیا کی نصف آبادی جاہل بھی ہے اور غریب بھی۔ غربت کا حال یہ ہے کہ اناج کے مذکورہ بھنڈار کے باوجود اپنے ملک کے علاوہ دنیا بھر میں بھوک سے ہزاروں اموات کا سلسلہ جاری ہے، دواؤں کی افراط کے باوجود غریب مریض بستروں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں اور ہر جگہ موت کا بازار گرم ہے۔ کپڑوں کے ہمالہ پہاڑ کے نیچے غربا سردیوں میں فٹ پاتھ پر ٹھٹھر ٹھٹھر کے مرنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح مکانات کے جنگل میں انہی مکانوں کے بنانے والے مزدور اور غربا جھگی جھونپڑیوں اور فٹ پاتھوں پر سونے کے لیے مجبور ہیں۔

غربت کا یہ عالم ہے کہ بعض مزدوروں کو مبلغ ساڑھے سات سو روپے ماہانہ ملتے ہیں تو بہت سے کارپوریٹ ملازمین کو ساڑھے سات لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ معمول کی بات ہے۔ امریکہ کو دنیا کا خوشحال ترین ملک مانا جاتا ہے مگر تقریباً ۳۵ کروڑ کی آبادی والے اس ملک کی دس فیصد آبادی آج بھی خط افلاس سے نیچے جینے پر اور ہزاروں غربا خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ دنیا کے ۲۰% امیر ترین ممالک کے لوگ زندگی کی تمام سہولتوں سے مالا مال ہیں۔ مگر ۶۰% لوگوں کو دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ UNDP کی ایک رپورٹ کے مطابق تین امیر ترین افراد کی دولت ۴۸ غریب ترین ممالک کی مجموعی پیداوار کے برابر ہے۔ چند سال قبل اکیلے بل گیٹس کی دولت، ہندوستان بھر کی دولت سے زائد تھی۔ ان سب پر مستزاد عالمی لوٹ کھسوٹ، کرپشن

اور گھوٹالوں کی بہار الگ ہے۔ جبکہ ایک اندازے کے مطابق اس عالمی جہالت و ناخواندگی اور اس کے نتیجے میں غربت و انسانی بحران کو صرف دس سال میں ختم کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ہر سال سات ملین ڈالر عمومی تعلیم پر خرچ کیا جائے۔ جو امریکہ کی سالانہ کوسمیٹک خرچ یا یورپ کی آئس کریم اور کولڈ ڈرنک کے سالانہ خرچ سے بھی کم ہے۔ کیا اب بھی اس قرآنی وارننگ پر غور و فکر کا وقت نہیں آیا ہے؟

''یمحق اللّٰہ الربا ویربی الصّدقات. واللّٰہ لایحب کل کفار اثیم ''(البقرہ. ۲۷۶)

''ترجمہ: اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو نما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے، بدعمل کو پسند نہیں کرتا۔''

قدروں کے بحران کا بھیانک منظر دیکھنا ہو تو اسی خوشحال امریکہ کی کرائم رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ ملک بھر میں ایک لاکھ سے زاید لڑکیوں کی سالانہ عصمت دری کی جاتی ہے، چنانچہ ۲۰ فیصد لڑکیاں اور ۱۰ فیصد لڑکے عمر بھر میں ایک نہ ایک بار خودکشی کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق صرف ایک سال ۲۰۱۰ء میں، لاطینی امریکہ سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قحبہ خانوں کے لیے ایک لاکھ لڑکیاں (عمر ۱۴ تا ۱۹ سال) اسمگل کی گئیں۔ جن میں صرف ۱۴۱ افراد پر مقدمہ کرکے سزائیں دی گئیں۔ ساری دنیا میں ہیومن ٹریفکنگ قابل سزا جرم ہے اس کے باوجود ساری دنیا میں اس کام کے لیے دلالوں کا ایک نٹ ورک قائم ہو چکا ہے۔ اس عالمی نٹ ورک کا سالانہ ۳۲۰۰۰ کروڑ ڈالر کا کاروبار جاری ہے۔ امریکی وزارت خارجہ کی ۲۰۱۲ء کی سالانہ رپورٹ کی رو سے ہر سال آٹھ لاکھ افراد اسمگل کیے جاتے ہیں جن میں ۵۰ فیصد بچے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ شراب خوری، جوا، عیاشی، ہم جنسی، ریل لائف فرینڈ شپ، جنسی استحصال، کہیں تجرد تو کہیں ہر معاملے میں بے اعتدالی و انتہا پسندی، بلکہ تفریحی قتل و غارت گری، ٹھگی، اغوا، رہزنی، ناجائز اسلحہ سازی، چنانچہ امریکہ میں جنگ ایک منافع بخش کاروبار سمجھا جانے لگا ہے۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق مدھیہ پردیش میں ایک بیوہ کو ساٹھ ہزار روپے میں اور ایک نوزائیدہ بچی کو چالیس ہزار روپے میں بیچ دیا گیا۔

اگر غور کیا جائے تو جرائم اور گناہوں کے اس سیلاب کے جنم داتا ۹۵ فیصد نام نہاد جدید تعلیم یافتہ مرد و زن ہیں۔ کھیت میں کام کرنے والا کسان اور رکشہ چلانے والا مزدور ان جرائم کا کوئی شعور نہیں رکھتا الّا یہ کہ پڑھے لکھے لوگ ان کا استحصال کریں۔ ؎

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تیری منتظر روز مکافات (اقبالؔ)

قدروں کے بحران کی انتہا یہ ہوگئی ہے کہ دنیا پڑھ لکھ کے دوبارہ دور جہالت اور حیوانیت سے بھی پرے جا گری ہے۔ ایک طرف بچیاں ماں کی کوکھ میں ماری جارہی ہیں تو دوسری طرف پرایا عورتوں کی کوکھ کو کرایہ پر لے کر بے اولادی کا غم غلط کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔ انسانی اعضا کی چوری کے لیے اغوا کا چلن شروع ہوگیا ہے۔ مرد، مرد سے اور عورت، عورت سے شادی کررہی ہیں۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس تعلیم جدید نے تین بنیادی رشتوں کا بحران پیدا کردیا ہے:۔(۱) انسان اور خدا (۲) انسان اور فطرت اور (۳) انسان اور انسان کے مابین متوازن رشتوں کے فقدان نے انسانی و اخلاقی ہی نہیں کائناتی بحران پیدا کردیا ہے۔..... (**بقیہ صفحہ نمبر ۵۲ پر**)

آخری صفحہ

دیکھو انھیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

تحریک اخوان المسلمین کے بانی امام حسن البناء شہیدؒ (۱۹۰۶-۱۹۴۹ء) بڑی شان اور پائے کے عالم، مرشد اور مصلح ورہبر گزرے ہیں، فقہی اور مسلکی وگروہی اختلافات کے سلسلے میں ان کا ایک واقعہ ہم ان سطروں میں بیان کرتے ہیں جو قابل ذکر ہے اور اس لحاظ سے برمحل ہے کہ یہ شمارہ جب آپ تک پہنچے گا تو رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا ہوگا اور ممکن ہے کہ بعض لوگ اسی مرض میں مبتلا ہوکر رمضان کا تقدس پامال کرنے کے ساتھ ساتھ وحدت امت کو پارہ پارہ کررہے ہوں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ (مصر کے) ایک گاؤں میں تقریر کرنے گئے، رمضان کا مہینہ تھا اور گاؤں کے لوگ تراویح کی رکعتوں کو لے کر دو گروہ میں تقسیم ہوگئے تھے کہ تراویح کی رکعتیں بیس ہیں یا آٹھ؟ ان کا اختلاف اس حد تک پہنچ گیا کہ لڑائی جھگڑے کی نوبت آگئی، ہر فریق یہ دعویٰ کررہا تھا کہ وہی حق وسنت پر ہے۔ مگر جب ان لوگوں کو حسن البناء کی آمد کا پتہ چلا تو اس نزاعی مسئلہ میں ان کو حکم بنانے پر اتفاق کیا، جب یہ مسئلہ حسن البناء شہیدؒ کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے ان سے سوال کیا، کہ نماز تراویح کا کیا حکم ہے؟ لوگوں نے جواب دیا سنت ہے۔ پھر پوچھا کہ مسلمانوں میں باہمی اخوت اور بھائی چارہ کا کیا حکم ہے جواب ملا یہ ایک دینی فریضہ اور ایمان کا ایک ستون ہے۔ اپنے حکیمانہ سوال کا جواب جب امام صاحب (حسن البناءؒ) نے پالیا تو فرمایا کہ کیا یہ جائز ہوسکتا ہے کہ سنت کی خاطر ایک دینی فرض کو ضائع کردیا جائے؟ یاد رکھو! اگر تم اخوت اور باہمی اتحاد پر قائم رہو اور پھر تم میں سے ہر شخص آٹھ یا بیس رکعت میں سے جس پر اس کا دل مطمئن ہو پڑھ لے تو اس لڑائی جھگڑے سے کہیں زیادہ بہتر ہوگا۔

اس واقعہ میں ان تمام مسلمانوں کے لئے عبرت اور درس ہے جو ہمیشہ تراویح کی رکعتوں کے بارے میں بحث ومباحثہ کرتے ہیں اور اپنے علمی پر مبنی تشدد کے باعث امت کا شیرازہ بکھیرتے ہیں، اور بحث وتحقیق کے کتابی اور مجلسی دائرے اور حدود کو چھوڑ کر دیواری پوسٹر بازی سے کام لیتے ہیں اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وقت کا اہم ترین مسئلہ یہی ہے۔ کیا ایک ایسے زمانہ میں جب کہ باطل طاقتیں پورے زور اور شدومد کے ساتھ اسلام کو بیخ وبن سے اکھاڑ دینے کی کوششیں کررہی ہیں، اور ہماری نسل نو مذہب کے بنیادی تصورات سے غافل ہے، کیا ہم مسلمانوں کو یہ زیبا دیتا ہے کہ ہم اپنی توانائیاں فروعی بحثوں میں ضائع کریں اور دشمن کو مضبوط بنانے کا ذریعہ بنیں۔ ایسے ہی ضمیر اور ملت فروش مسلمانوں کے لئے شاعر نے کہا ہے ؎

دیکھو انہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

☆☆☆

(م۔ق۔ن)

رمضان کا پیغام

پھر آ گیا نیکیوں کا موسم بہار

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

زندگی کو جس قدر بھی ناز ہو کم ہے، ایک بار پھر نیکیوں کا موسم بہار ہاتھ آ گیا، ایک ماہ کی یہ مدت قلیل، کس طرح اس میں رحمتوں کے نزول کی ارزانی وفراوانی ہوگی، اللہ اکبر خدا تعالیٰ ایک کے بدلہ ستر ستر دیگا، خوش نصیب وہی ہے جو خوب فائدہ اٹھائے، جو نیکیوں سے اپنی جھولی بھر لے، رمضان کا روزہ جسے خدا نے **کتب علیکم الصیام** کہہ کر فرض کر دیا، اور **ایام معدودات** کہہ کر فطرت انسانی کا بھر پور خیال رکھا، کہ کہیں بوجھ نہ محسوس ہو کہ ایک ماہ کے روزے! قرآن نے کہا کہ بس چند دن تو ہیں، آہ ایسا مبارک مہینہ اور ایسی مبارک راتیں، روزہ، تراویح، تلاوت، سحری وافطار سب باعث ثواب، پیٹ کے روزہ کا الگ ثواب، آنکھ منہ ناک کان ہاتھ پیر سب کے روزے کی الگ فضیلت اور ثواب میں اضافہ کا سبب، سحری کرنا باعث ثواب، کسی کو افطار کرانا اجر کا سبب اپنے آپ کو گناہوں سے روکنا ثواب کا سبب، گو جس طرح چاہے انسان اللہ جل شانہ سے اجر لے لے کہ موسم بہار میں تو کبھی کبھی سوکھے ہوئے درختوں میں بھی پتے نکل آتے ہیں۔

روزوں میں اپنے آپ کو بچا کر رکھنا ہے، عبادات کثرت سے کرنی ہیں نا کہ وقت گذاری کیلئے صرف بستر کو شرف بخشنا ہے، اور نیند کے مزے لینے ہیں، اور کوئی ایسا کام نہیں کرنا ہے جو کسی ایک عضو کے روزے کو توڑ کر باعث عذاب ہو، روزہ کا ایک مقصد مجاہدانہ زندگی کی تعلیم ہے، اب اس پر کہنا کہ رمضان میں تو کوئی کام ہی نہیں ہوتا، اس مقصد کے بالکل منافی ہے، اور اب تو سب کچھ الٹا ہو چلا ہے، پہلے روزے کے ذریعہ انسان فقراء وغرباء کی زندگی کا نمونہ دیکھتا تھا، لیکن اب تو انواع واقسام کی اشیاء سے پیٹ بھر کر امراء کی زندگی کے مزے لوٹتا ہے، اور کبھی کبھی تو وہ ان اشیاء کی فراہمی میں حرام سے بھی دریغ نہیں کرتا، رمضان میں صبح کو خوب شکم سیر ہو کر کھانے اور شام کو کھا کر پیٹ پر ہاتھ پھیرنے اور سونے سے رمضان کی مقصدیت بالکل فوت ہو جاتی ہے۔

رمضان امت محمدیہ کیلئے ایک مکمل پیغام اور ایک مثالی تربیتی نظام ہے، اسی لئے اس کے مکمل ہونے پر حکم ہے، **ولتکملوا العدة و لتکبروا اللہ علی ما ھداکم و لعلّکم تشکرون**، کہ اب آج اس بات پر شکر ادا کرو کہ خدا نے تم کو اس مدّت کو مکمل کرنے کی توفیق بخشی، اس پر تم کو خوب خوب اللہ کی بڑائی بیان کرنی چاہئے، اور عید کی خوشی بھی اسی شکرانہ کے طور پر منانی چاہئے، اسلامی نظام بھی کیسا مستحکم ہے، کہ ایک ماہ کی تربیت اور مجاہدانہ تربیت کے بعد قومی تہوار اور قومی خوشی کا دن مقرر کر دیا، اور اسے بھی اجتماعیت کا مظہر بنا دیا، اور ایسا دن رکھا کہ خوشی میں انسان حتی المقدور بہکنے سے بچا رہے۔

☆☆☆

صدقۂ فطر

عید الفطر کے دن ایک متعین مقدار کا محتاجوں اور ضرورتمندوں کو دینا واجب ہے اسی کو صدقۃ الفطر کہتے ہیں، صدقۂ فطر ادا کر دینے سے روزہ مقبول ہوتا ہے، رمضان کی نعمت سے سرفراز ہونے کا شکریہ بھی ادا ہو جاتا ہے اور عید کی خوشی میں ان لوگوں کی بھی شرکت ہو جاتی ہے جو معاشی کسمپرسی کی وجہ سے پوری طرح اس موقع سے مسرور نہیں ہو پاتے ہیں۔

ہر آزاد مسلمان مالک نصاب پر صدقۂ فطر واجب ہے، اس کے واجب ہونے کے لئے مال پر ایک سال گزر جانا شرط نہیں ہے۔ نہ ہی مال کا تجارتی ہونا شرط ہے، اور نہ ہی صاحب مال کا عاقل و بالغ ہونا شرط ہے، حتی کہ نابالغ بچوں اور مجنونوں پر بھی صدقۂ فطر واجب ہے، ان کے اولیاء کو ان کی طرف سے ادا کرنا چاہئے، اسی طرح بالغ اولاد اگر مالک نصاب نہ تو بھی ان کے اولیاء پر ضروری ہے کہ ان کی طرف سے ادا کریں۔

صدقۂ فطر کے واجب ہونے کے لئے روزہ دار ہونا شرط نہیں ہے، چنانچہ جس نے رمضان کے روزے نہ رکھے ہوں چاہے عذر کی وجہ سے یا بلا عذر اس پر بھی یہ صدقہ واجب ہے،

صدقۂ فطر کے مستحقین بھی وہی ہیں جو زکوۃ اور عشر کے ہیں، ان کے سوا کسی اور کو صدقۂ فطر دینا جائز نہیں۔

اس کا وجوب عید الفطر کی فجر طلوع ہونے پر ہوتا ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ رمضان یا اس سے پہلے ادا کر دیا جائے تا کہ جس مقصد سے تحت کسی کو دیا جا رہا ہے وہ اس کو پورا کر سکے، ہمارے یہاں عموما عید کے دن ہی ادائیگی کا رواج ہے، ضرورت ہے کہ اسے بدلا جائے تا کہ مستحقین پوری طرح اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

صدقۂ فطر میں گیہوں، یا اس کا آٹا اور ستو آدھا صاع ادا کرنا واجب ہے اور چھوہارے، منقے اور جو کا ایک صاع یا اس کی قیمت کے برابر نقدی یا کوئی سامان دے دے، آج کل کے حساب سے ایک صاع ۳،۱۸۰ (تین کلو ایک سو اسی گرام) کے برابر ہے۔

ایک اہم بات: ہمارے معاشرے میں عموما نقدی ادا کی جاتی ہے اور اس کا حساب گیہوں کی قیمت سے لگایا جاتا ہے، مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اسلام کے ابتدائی دو رمیں جب یہ احکام مقرر کیے جا رہے تھے گیہوں کی قیمت چھوہارے اور منقے وغیرہ سے دونی (ڈبل) ہوتی تھی اسی لئے چھوہارے وغیرہ میں ایک صاع اور گیہوں میں اس کا نصف یعنی آدھا صاع مقرر کیا گیا تھا،

مگر آج جبکہ گیہوں کی قیمت چھوہارے وغیرہ سے بہت زیادہ گر گئی ہے تو ان لوگوں کو چاہیے جو وسعت رکھتے ہیں کہ چھوہارے اور منقی وغیرہ کی قیمت دیا کریں کیوں کہ حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تمہیں وسعت عطا کرے تو تم بھی وسعت سے کام لو۔ اگر چہ صدقۂ فطر گیہوں کی قیمت سے بھی ادا ہو جائے گا مگر وسعت سے کام لینا بہر حال مستحب ہے۔

محمد فرید حبیب ندوی